ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

اقبال ریویو

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

خصوصی پیشکش

اقبال
اور
قائد ملت بہادر یار جنگ

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان
(اپریل ۲۰۰۵ء)

اقبال ریویو

خصوصی پیشکش

اقبال اور قائدِ ملّت بہادر یار جنگ

(قائدِ ملّت بہادر یار جنگ کے صد سالہ یوم پیدائش
۵/مارچ ۲۰۰۵ء کے موقع پر شایع کیا گیا۔)

جلد (۱۴) شمارہ (۱)

ISBN.81-86370-27-7

مجلس مشاورت

۱۔ پروفیسر سید سراج الدین (صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)
۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)
۳۔ جناب زکریا شریف (ممبئی)

مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد
۲۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر
۳۔ سید امتیاز الدین۔ایڈیٹر

بدل اشتراک

فی شمارہ ۴۰ روپے ایک سال (دو شمارے) ۷۵ روپے
بیرونی ملک فی شمارہ، ۵ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ ۔حیدرآباد۔500028

آندھرا پردیش (انڈیا)۔فون:55663950

e-mail:ihfiqbal@hotmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد کلیم محی الدین قادر، ''شارپ کمپیوٹر'' محبوب بازار،
چادر گھاٹ حیدرآباد۔۲۔فون:55704044

سید امتیاز الدین ایڈیٹر، پرنٹر و پبلیشر نے وی جی پرنٹر لسکھ نگر، حیدرآباد سے طبع کروا کر
اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

سلسلہ نشان	عنوان	مضمون نگار	صفحہ نمبر
۱	مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں	اداریہ	۵
	شخصیت: نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز		
۲	کیا پوچھتے ہو کسے کھو دیا	سید خلیل اللہ حسینی	۹
۳	علامہ اقبال اور قائد ملت	سید محمد مصلح الدین سعدی	۱۵
۴	بہادر یار جنگ یا متشکل فکر اقبال	مولانا غلام محمد	۲۱
	اقبال کا مثالی پیکر: اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو		
۵	علامہ اقبال اور قائد ملت بہادر یار جنگ	ڈاکٹر غلام دستگیر رشید	۲۸
۶	بہادر یار جنگ اور اقبال	نظر حیدرآبادی	۳۲
۷	علامہ اقبال اور بہادر یار جنگ	محمد احمد خان	۳۶
۸	علامہ اقبال اور قائد ملت	نذیر الدین احمد	۴۲
۹	تعلیمات اقبال سے لگاؤ	مولانا غلام محمد	۵۴
	نقوش راہ: نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر		
۱۰	درس اقبال	نذیر الدین احمد	۵۹
۱۱	نواب بہادر یار جنگ اور درس اقبال	سید حامد علی	۶۲
۱۲	بزم اقبال حیدرآباد دکن	حسن یار جنگ	۶۷
۱۳	ادارۂ اقبال لکھنو	عبدالوحید خان	۶۸
	آزادی کی دولت دل روشن، نفس گرم		
۱۴	اقبال کا پیام آزادی	قائد ملت بہادر یار جنگ	۷۰
۱۵	اقبال کا شاہین زادہ	قائد ملت بہادر یار جنگ	۸۵
	عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے		
۱۶	خطبات بہادر یار جنگ سے اقتباسات		۸۷
۱۷	حیات بہادر یار جنگ۔ بہ یک نظر		۹۱

○○○○

○

''نواب صاحب کو بچپن ہی سے قرآن سے گہرا اور قلبی لگاؤ تھا اس کا پس منظر یہ تھا کہ وہ پیدا ہوئے اور ایک ہفتے کے اندر ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ان کی نانی فتح خاتون نے نواب صاحب کی تعلیم وتربیت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، وہ اپنی نانی کی حیات تک (یعنی ۱۴ سال کی عمر تک) ان ہی کے زیر سایہ پرورش پاتے رہے۔ یہ ایک دین دار اور خدا ترس پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ علمی، ادبی اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ ان کے معمولات میں شامل تھا۔ نواب صاحب کو مطالعہ کا شوق نانی کے گھر ہی سے پیدا ہوا، یہ بجد مذہبی قسم کی خاتون تھیں، اپنے نواسے کو بھی مذہبی رنگ میں رنگ دیا۔ اس طرح بچپن سے ہی ادائے نماز اور تلاوت قرآن پاک کی پابندی نواسے پر لازم کر دی۔ کسی دن تلاوت قرآن پاک کے بغیر صبح کے سلام کو نانی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سلام کا جواب نہ ملنے پر استفسار فرمایا تو جواب ملا:

''تم نے اللہ میاں سے آج باتیں نہیں کیں اس لئے نہ میں تم سے بات کروں گی اور نہ تمہارا سلام لوں گی۔''

نواب صاحب تربیت کی اہمیت کا جب بھی ذکر فرماتے تو فرمایا کرتے:

''میرے اندر جو کچھ ہے وہ اسی چودہ سال کی کمائی کا حاصل ہے۔''

(سوانح بہادر یار جنگ جلد دوم۔ مرتبہ نذیر الدین احمد)

○

اداریہ

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں.....!

قائد ملت نواب بہادر یار جنگ کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر، اقبال اکیڈیمی کے جریدہ اقبال ریویو کی یہ خصوصی پیش کش ہدیۂ ناظرین ہے، بہادر یار جنگ ۵/مارچ ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں، امر سے آگاہ یہ مرد مومن اس دنیائے فانی سے سفر کر گیا۔ اس طرح ان کی زندگی کے چالیس سال بھی مکمل نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اس مختصر مدت میں ''نہیں ہے بندۂ مومن کے لئے جہاں میں فراغ'' کے مصداق ان کی پوری زندگی سوز درون اور جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ ان کے کارناموں کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، شاید صرف یہ کہنا کافی ہے کہ انھوں نے اس نہایت ہی کم عرصۂ حیات میں نہ صرف حیدرآباد دکن بلکہ سارے ہندوستان میں ہلچل مچادی۔

کسی بھی بڑی شخصیت کے کئی کارنامے ایسے ہوتے ہیں جو ان کے اپنے دور کی پیداوار ہوتے ہیں اس لئے کسی بھی شخصیت کو پرکھنے، جانچنے کے لئے اس عصر کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ ہم وقتی ہنگاموں اور اس کے اثرات سے متاثر ہوکر نہ سابقہ ریاست حیدرآباد باقی رہی، نہ سیاست کی وہ ہنگامہ آرائیاں باقی رہیں، نہ حالات کے وہ پیچ وخم رہے جن کو سلجھانے میں ان کی مختصر عمر عزیز کا بڑا حصہ صرف ہوا بعض شواہد اور قرائن کی روشنی میں یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ اندرونی اور بیرونی مخالفتوں اور سازشوں کا دانشمندی سے سامنا کرتے ہوئے وہ حیدرآباد کی سیاست کو جس رخ پر لے جانا چاہتے تھے، وہ کچھ اور ہوتی۔ لیکن ان کی اچانک اور بے وقت موت نے اس کی مہلت نہ دی۔ لیکن بہت سے کارنامے ایسے ہیں جو انھیں اپنے عصر سے بلند بنادیتے ہیں اور جن کا فیضان جاری رہتا ہے۔ ان کی سیاسی تگ ودو سے اگر ہم صرف نظر کرلیں جو آج کے دور میں بے معنی ہے تو اُن کی شخصیت کے کئی تابناک پہلو ہمارے

سامنے آتے ہیں جن کی معنویت زمانہ کی پابند نہیں ہوتی۔ بہ حیثیت ایک انسان کے وہ ایک اعلیٰ ظرف، وسیع المشرب، دیانت دار، مخلص اور انسانیت دوست شخصیت کے حامل تھے جس کا ثبوت ان کی زندگی کے کئی واقعات سے دیا جاسکتا ہے۔ بے رحم سیاست نے ان کی زندگی کے کئی پہلوؤں پر نقاب ڈال دئے۔ ان کی انسانیت دوستی کے ثبوت کے لئے یہاں صرف ایک واقعہ بیان کرنا کافی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زمین کی ملکیت کے بارے میں ایک تنازعہ میں دونوں فریقوں نے انھیں ثالث بنایا۔ انھوں نے فیصلہ ہندو برادران وطن کے حق میں دیا۔ وہ خوش ہوئے کہ انھوں نے ایک سچے اور دیانت دار شخص پر اعتماد کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔ بعض ناراض مسلمانوں کو انھوں نے سمجھایا کہ قرآن مجید میں اللہ سبحانہ نے عدل کا حکم دیا ہے۔ چاہے فیصلہ اپنوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، سیاست سے ہٹ کر، اُس وقت کے حیدرآباد کے سماج میں اخلاقی، تعلیمی، معاشی بہتری کے لئے ان کے کئی اقدامات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

اُن کے نہایت قریب رہنے والے رفقا، گواہی دیتے ہیں کہ اُن کی زندگی اقبال کے تصور مردِ مومن کا عملی پیکر تھی۔ وہ اقبال کی شخصیت اور ان کے دلنواز اور پرسوز پیام کے عاشق تھے۔ پروفیسر غلام دستگیر رشید نے لکھا۔ ''اُن کی فکر ونظر کا ایک سرچشمہ شیریں اقبال تھا، اقبال کے کلام میں انھیں فکر ونظر کا ایک آئینہ مل گیا تھا۔'' ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کہتے ہیں۔ ''انھوں نے اقبال کے پیام وکلام کی روح کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا، یہی وجہ ہے کہ اقبال کا قال اُن کا حال بن گیا تھا۔'' لیکن خود اقبال کے روحانی فکری اور تخلیقی سرچشمے کیا تھے۔؟ یہ سرچشمے تھے، قرآن مجید کی ابدی تعلیمات سے بے پناہ شغف، رحمۃ للعلمین ﷺ سے شدید محبت، انسانیت اور ملت کے لئے دردمندی اور تڑپ۔! بہادر یار جنگ بھی ان ہی سرچشموں سے فیض یاب تھے۔ اس بات کی تصدیق آپ کو ریویو کے ان صفحات سے ہوجائے گی۔ بہادر یار جنگ اقبال کی اس ''متاعِ دردو سوز آرزو مندی'' کو اپنے قافلے میں لٹاتے رہے۔ ان کی پرجوش تقاریر، محافل درس اقبال، اقبال فہمی کے لئے اداروں کے قیام میں ان کی حوصلہ افزائی، یہ سب باتیں ان کے تذکروں میں محفوظ ہیں۔ شاید ایک اشارہ یہاں بے محل نہ ہوگا کہ ابتدا میں خود اقبال اور پیام اقبال کی پذیرائی میں حیدرآباد کے ارباب سیاست کا رویہ موافق نہیں تھا۔ لیکن بہادر یار جنگ کی پرخلوص مساعی نے اس پیام کو عوام اور خواص میں مقبول بنادیا اور سربراہان حکومت بھی تحسین اقبال میں شامل

ہو گئے۔ اور آج بھی ان کے فیضان کا سلسلہ جاری ہے۔

تعمیر ملت اور اقبال اکیڈیمی کے بانی جناب سید خلیل اللہ حسینی، بہادر یار جنگ کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔ ملت کی تعمیر نو میں ان کے جرأت مندانہ اقدامات ایک اعتبار سے بہادر یار جنگ کی آرزو کی تکمیل تھے۔ اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی اقبال اکیڈیمی کا قیام ہے۔ جو بہادر یار جنگ کی مساعی کا تسلسل ہے۔ آج اکیڈیمی کی سرگرمیاں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ وسائل کی کمی کے باوجود اکیڈیمی کی مساعی کے تذکرے نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندستان سے باہر بھی ہو رہے ہیں۔

اقبال اکیڈیمی کی جانب سے یہ پیش کش بہادر یار جنگ کی خدمت میں ایک خراج عقیدت ہے ایک ایسی عقیدت جس کی جڑیں صرف ماضی میں پیوست نہیں ہیں بلکہ اس شاندار روایت کا ایک ایسا سلسلہ ہیں جو مستقبل میں بھی انشاء اللہ العزیز جاری رہے گا۔

ناسپاس گذاری ہوگی اگر میں جناب نذیر الدین احمد کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے تین ضخیم جلدوں میں حیات بہادر یار جنگ کے علاوہ ان پر اور کئی کتابیں مرتب کی ہیں۔ بہادر یار جنگ پر کسی بھی تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لئے یہ کتابیں اساسی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس ریویو کے مضامین کے انتخاب میں موصوف کی مرتبہ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بہادر یار جنگ اکاڈمی کراچی اور حیدرآباد کی مطبوعات وغیرہ سے بھی بعض مضامین اخذ کئے گئے ہیں۔

(محمد ظہیر الدین احمد)

○○○○○

اے کہ ترا سرِ نیاز حدِّ کمالِ بندگی

(بہادر یار جنگ شاعری بھی کیا کرتے۔ تخلص خلق تھا۔ ان کے یہ نعتیہ اشعار جذباتِ عقیدت کے آئینہ دار ہیں۔)

اے کہ ترے وجود پر خالقِ دو جہاں کو ناز
اے کہ ترا وجود تھا وجہِ وجودِ کائنات

اے کہ ترا سرِ نیاز حدِّ کمالِ بندگی
اے کہ ترا مقامِ عشق قربِ تمام عینِ ذات

اے کہ تری زبان سے ربِّ قدیر گلفشاں
وحیِ خدائے لم یزل تھی تری ایک ایک بات

اے کہ تو فخرِ آدمی، واقفِ سرِّ عالمیں
لوح و قلم سے بے نیاز تیرے علوم شش جہات

تیرے عمل سے کھل گئیں، تیرے بیاں سے حل ہوئیں
منطقیوں کی اُلجھنیں، فلسفیوں کی مشکلات

خوگرِ بندگی جو تھے، تیرے طفیل میں ہوئے
مالکِ مصر و کاشغر، وارثِ دجلہ و فرات

مجھ سے بیاں ہو کس طرح رفعتِ شانِ احمدیؐ
تنگ مرے تصورات، پست مرے تخیلات

○○○○○

سید خلیل اللہ حسینی
بانی کل ہند مجلس تعمیر ملت وصدر اقبال اکیڈیمی

کیا پوچھتے ہو، کسے کھو دیا

''جناب سید خلیل اللہ حسینی مرحوم نے سقوط حیدرآباد کے بعد ناسازگار حالات میں بہادر یار جنگ کے چھوڑے ہوئے نقوش راہ پر نہ صرف وجوانوں کو گامزن کیا بلکہ پیام اقبال کو عام کرنے کی کوششوں کو جاری رکھا، اسی مناسبت سے یہ مضمون ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔'' (ادارہ)

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

سطح سمندر پر بارش کے بے حساب قطرے پڑتے ہیں لیکن چند ہی کے نصیب میں رہتا ہے کہ دہن صدف کی زینت بنیں اور موتی بن کر چمکیں، موتیاں تو پھر بھی مل جاتی ہیں لیکن وہ گہر آبدار جو سینۂ فطرت کے حسن کو نکھار دے، کم ہی ملتے ہیں، اور جب کبھی بھی ملتے ہیں، دنیائے حسن کی رونق دوبالا کر دیتے ہیں۔

یوں تو ہر روز شاخ گل تو جھومتی ہے کلیاں مسکراتی ہیں مرجھا جاتی ہیں، نہ باغباں توجہ کرتا ہے نہ نازنینان سیر پسند، لیکن کبھی کسی شاخ حیات پر وہ پھول کھلتا ہے جو باغبان کی زندگی کا حاصل اور چمن کی آبرو بن جاتا ہے اس کا بے مثال حسن اور جانفزا رنگ، سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں اور لگتا ہے کہ یوں تو بہار کا پیام حیات ساری چمن کے لئے ہے مگر یہ پھول نازنین بہار کی تمناؤں کا حاصل ہے، فطرت کا الیلا فرزند ہے، جس کے لئے عناصر فطرت نے توجہ خاص صرف کی ہے، اور مصور فطرت نے اس کو بنا کر گویا اپنے کمال فن پر ناز کیا ہے۔

موتیوں اور پھلوں کی دنیا کی طرح انسانوں میں بھی کبھی کوئی واقعی انسان، کوئی باکمال ہستی اور کوئی عظیم شخصیت پیدا ہو جاتی ہے جو انسانیت کے ماتھے کا چمکتا ٹیکہ اور عروس انسانیت کا جھلملاتا زیور بنا، انسان کے گرتے مقام کو سنبھال لیتا ہے۔

بہادر خان، ایسے ہی ایک فرد تھے جو بتول سلیمان ندوی مرحوم ''سینکڑوں سال میں پیدا ہوتے ہیں اور جب کبھی ہوتے ہیں انقلاب آفرین ہوتے ہیں۔

عام طور پر بہادر خان لسان الامت کے خطاب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ انکی خطیبانہ عظمت کا اکثر تذکرہ ہوتا رہتا ہے اور بلاشبہ وہ دنیائے اُردو کے فقید المثال خطیب تھے لیکن ان کی خطیبانہ باندآہنگی نے انکی شخصیت کو چھپا دیا۔ ان کی شعلہ نوائی نے ان کی جان پُرسوز کے لئے پردہ کا کام کیا۔ لوگوں نے شمع کا نور دیکھا۔ اس کے سوز دل کا انداز نہیں کیا۔ جگنو کی چمک دیکھی لیکن اس عاشق وارفتہ کی جگر سوزی اور اضطرار کا راز نہ جان سکے۔ اقبال کو شکایت تھی کہ لوگوں نے انہیں شاعر اور مغنی سمجھ لیا ہے لیکن اس پیام پر ان کی نظر نہیں گئی جو انکی نوائے عاشقانہ کا حاصل تھی۔

بہادر خاں اگر صرف خطیب ہوتے تو اپنی ساری مشاقی خطابت اور مقررانہ عظمت کے باوجود پھر بھی قابل ملت نہ ہوتے۔ اگر ان کی غیر معمولی تنظیمی صلاحیت کی تعریف مقصود ہے تو بلاشبہ اس میدان اجتماعی میں بھی وہ اپنی نظیر آپ تھے لیکن تنظیمی صلاحیت ان کی عظمت کا راز نہ تھی۔ اگر ان کی دل موہ لینے والی قد آور شخصیت کی ستائش کی جاتی ہے تو بھی بے جا ہے کہ ایک عظیم اور پُر اسرار شخصیت اپنے دلربا تبسم سے دلوں کو مٹھی میں لے لیتی ہے اور دلوں کو مسخر کرنے کا ان کا فن خوبان شہر کے لئے بھی باعث صد رشک وحسرت تھا لیکن یہ دلآویزی طبع بجائے خود عظمت بہادر خاں کی کلید نہیں ہے۔

اگر بہادر خان کی بے پناہ جرأت کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہونا چاہئے۔ ایک مسلمان اور پھر پٹھان، اگر جری نہ ہوتا تو کیا ہوتا، ایک مرد خود آگاہ و خدا مست بے باک نہ ہو تو اور کون ہوگا؟ لیکن انسانیت کی تاریخ عموماً اور مسلمانوں کی تاریخ خصوصاً بہادروں کے تذکرہ سے بھری پڑی ہے جرأت کم ہوتے ہوئے بھی اتنی عام صنف ہے کہ بہادر خان کے لئے افتخار کا طرہ نہیں بن سکتی۔

سوانح نگاروں نے ان کی غیر معمولی قوت حافظہ کی بات کہی ہے بلاشبہ ان کا حافظہ بلا کا اور یادداشت غضب کی تھی لیکن یہ صلاحیت خدا کی دی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں کسب کا دخل کم ہوتا

ہے اس لئے وجہ ناز اور سرمایہ افتخار نہیں ہوسکتی۔

بہادر خان کی عظمت کا راز یہ تھا کہ وہ ایک انسان تھے انسانوں کی دنیا میں انسان تھے اور یہی بڑی غیر معمولی بات ہے!

انسان، انسانیت کی ان صفات عالیہ سے عبارت ہے جن کی بنا پر ''وہ حیوان ..... ہم جسے انسان کہتے ہیں'' احسن التقویم کے تاج زرنگار سے آراستہ ہوا، خلیفۃ اللہ فی الارض کے وہ فرمان سے مشرف ہوا اور خدا کی ساری مخلوق میں ممتاز ہوا بلکہ مقربان بارگاہ الٰہی کا مسجود بنا۔

بہادر خان کے اخلاق ایسے اعلیٰ تھے کہ لوگوں نے بجا طور پر کہا ہے کہ بیسویں صدی میں صحابہؓ کی زندگی کا نمونہ نظر آتا تھا، ان کی ملنساری اور خوش مزاجی ان کا انکسار اور خودداری لوگوں کے کام آنے کا جذبۂ بے اختیار، پرائی آگ میں پڑنے کا شوق والہانہ، غریبوں کی دستگیری، بیواؤں کی امداد، طالب علموں کی اعانت، غرض وہ اخلاق فاضلہ جن کا واسطہ دے کر حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے رحمت عالم سے فرمایا تھا کہ آپ لوگوں کے کام آتے ہیں، ضرورتمندوں کی دستگیری کرتے ہیں ..... اس لئے خدا آپ کو تنہا نہ چھوڑیگا۔ ان صفات کی اس دور میں جھلک دیکھی تو محمد عربی ﷺ کے اس غلام میں دیکھی جس کی آنکھیں اپنے آقا کے تذکرے پر اشکبار ہو جاتی تھیں۔

کتنے مسلمان اور غیر مسلم اصحاب نے گواہی دی کہ ان کے آڑے وقتوں میں بہادر خان نے کس طرح ان کی مدد کی۔ بہت سوں کی تو اسطرح مدد کی کہ مدد پانے والے کو پتہ نہ چل سکا کہ ان کا گمنام محسن کون ہے؟

بہادر خان کی وفات پر سب سے اچھی نظم کہنے والی ایک خاتون شاعرہ تھیں اور سب سے اچھا خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں ان کے مسلک کے شدید مخالف مسلمان یا پارسی اور ہندو لیڈر تھے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے۔ ان کی تقریروں پر جھومنے والے مسلمان ان کو پوری طرح سمجھ نہ سکے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک بھی کوئی ایسا خراج عقیدت نہ پیش کر سکے جو ان کے شایان شان ہوتا ہے۔

ہاں! ان کو سمجھا تو طبقۂ نسواں نے کہ اسے اپنی مظلومی اور محرومی کا احساس تھا اور بہادر خان کے روپ میں انہیں ایک اللہ کا بندہ ایسا ملا تھا کہ انہیں یقین تھا کہ اللہ کے دیئے ہوئے سارے حقوق وہ ان کو دلوا کر رہے گا۔

ان کے مسلک سیاسی کے مخالف جو مسلمان تھے انھوں نے اختلاف کے طوفان میں بھی بہادر خاں کو ایک شریف دشمن پایا۔

پارسی طبقہ تھا جس کو یہ یقین تھا کہ بہادر خان جیسے انسان کے ہوتے ہوئے انھیں اپنے حال اور مستقبل کی کوئی فکر نہ کرنی چاہئے۔

ہندو لیڈر تھے جو بہادر خان سے بارہا ''گفتگوئے مفاہمت'' کر چکے تھے۔ ان میں مسٹر نرسنگ راو کا تذکرہ ضروری ہے کہ انھوں نے کہا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتے تھے اور کوئی بات طے ہو جاتی تو ہمیں اعتماد رہتا کہ بہادر خان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

گلبرگہ میں ایک مسجد سے متصل خطۂ زمین کے حق ملکیت کے بارے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں نزاع پیدا ہوئی۔ ہر فریق کو اپنے حق پر اصرار تھا، جھگڑے نے طول کھینچا اور صورت حال ناگوار ہوتا دیکھ کر بعض سمجھداروں نے مشورہ دیا کہ ثالثی سے تصفیہ کرلیا جائے۔ اتفاق دونوں فریقوں کا ہوا۔ بہادر خاں پر، مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ بہادر خان مسلمانوں کے لیڈر ہیں اس لئے مسلمانوں کے حق میں فیصلہ کریں گے۔ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ ایک سچا انسان ہے کیونکہ پکا مسلمان ہے اس لئے وہ ناانصافی نہیں کرے گا۔ لطف کی بات تو یہ ہوئی کہ نواب صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہندوؤں کا دعویٰ درست ہے اور مسلمانوں کا غلط۔ چنانچہ انھوں نے یہی فیصلہ دے دیا۔ مسلمان ناراض ہو گئے لیکن بہادر خان نے انھیں قرآنی ارشاد سنایا کہ کسی قوم سے مخالفت تم کو ناانصافی پر نہ ڈالدے، انصاف کرو کہ وہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ مسلمان تو خاموش ہی ہو گئے لیکن ہندوؤں نے سمجھا کہ ان کا اندازہ کتنا صحیح تھا کہ ایک سچے مسلمان پر وہ بھروسہ کر سکتے ہیں کہ سچا مسلمان شریف انسان ہوتا ہے۔

لوگوں سے ملنے جلنے کے انداز، چھوٹوں سے محبت، اور بڑوں کا ادب، ان صفات کا پیکر میں نے تو صرف بہادر خاں کو دیکھا۔ چھوٹوں سے شفقت کا تو میں بھی گواہ ہوں۔ میں ایک کم عمر طالب علم کی حیثیت سے درس اقبال کی محفلوں میں جاتا اور کسی کونے میں بیٹھ جاتا۔ ایک مرتبہ وہ میرے قریب آئے۔ نام پوچھا، تعلیم کے بارے میں سوال کیا اور ہمت افزائی کے چند کلمات کہے، بات آئی گئی ہوگئی۔

اب اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ وہ موٹر میں جا رہے ہوں اور میں سیکل پر لیکن سلام میں پہل ہوتی موٹر میں سے۔ پہلی مرتبہ جب دارالسلام روڈ پر ایسا سابقہ ہوا تو جواب دینے میں غالباً میرے دونوں ہاتھ اٹھ گئے اور میں سیکل سے گرتا گرتا بچا۔

جن کو وہ اپنا بزرگ سمجھتے تھے ان کا احترام کس انداز سے کرتے تھے اس کا ایک آنکھوں دیکھا واقعہ سنا دوں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تشریف لائے ہوئے تھے۔ نظامیہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم مولانا کو دیکھنے چلے گئے ہوٹل کے کمرے میں مولانا تھے۔ بہادر خان، غالباً انھیں لینے کے لئے آئے تھے اور کمرے کے باہر کچھ فاصلہ پر کھڑے ہوئے گفتار کے شگفتہ پھول برسا رہے تھے۔ اس زندہ دل انسان کی گفتگو میں، میں ایسا محو ہوگیا کہ بھول ہی گیا کہ مولانا مودودی سے ملنے آیا ہوں۔ اتنے میں مودودی صاحب باہر تشریف لائے۔ انہیں دیکھتے ہی بہادر خان نے اپنے ہاتھ سے سگریٹ اس طرح پھینک دیا جس طرح ہم اپنے والد کو دیکھ کر گھبراہٹ کے عالم میں ایسی اضطراری حرکت کر بیٹھتے ہیں۔

ایک چپراسی صاحب، بہادر خان کے بڑے اعتماد کے کارکن تھے۔ ایک دفعہ جب وہ ملنے گئے اور کمرہ میں بلا لئے گئے تو بچارے ٹھٹک سے گئے۔ کیوں کہ اس وقت بہادر خان سے انکے ناظم صاحب مصروف تکلم تھے۔ بہادر خان نے بات کو تاڑ لیا اور کہا کہ آپ چپراسی ہونگے دفتر میں، میرے پاس تو سب برابر ہیں بلکہ آپ تو میرے رفیق ہیں یہ کہہ کر ان کو اپنے بازو صوفہ پر بٹھالیا۔

ایسے واقعات کا انبار لگایا جاسکتا ہے اور ایسا واقعہ بہادر خان کی شرافت، خلوص، انسانی محبت اور جذبۂ خدمت کا ثبوت دیتا رہے گا بہادر خاں کا حال پہاڑ کی بلند چوٹی کا سا تھا۔ دور سے دیکھئے تو جاہ و جلال کا منظر، قریب ہوتے جایئے تو آنکھوں کو ٹھنڈک، دل کو طراوت اور طبیعت کو تازگی ملتی پھر دنیا کا منظر ہی کچھ اور حسین نظر آتا۔

آج انسانوں کے ہجوم میں انسان نہیں ملتا۔ انسانوں کے روپ میں شیاطین اور درندے ملتے ہیں۔ جھوٹے، بے ایمان، ضمیر فروش، ظالم، دھوکہ باز، غرض جملہ شیطانی صفت سے متصف ایسے فرزندان ابلیس نظر آتے ہیں۔ لیکن بہادر خان جیسے انسان جب سامنے آتے ہیں تو یقین

ہو جاتا ہے کہ ابھی اللہ کے ایسے بندے موجود ہیں۔

مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ بہادر خان کائنات کی وسیع پہنائیوں میں گھومتے ہوئے محض اپنی سادگی سے ہم لوگوں میں آ گئے تھے۔ وہ اس گندہ دنیا اور رذیل انسانیت کے تکلیف دہ ماحول کے لئے موزوں نہ تھے۔ وہ ایسا گل سرسبد تھے جو ایوان فطرت کے رنگ و بو میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ ان کا اس دنیا میں آنا ایسا تھا گویا اس گل رنگین کو انسانیت کی مزار پر ڈال دیا گیا ہو۔

یہ مکر بھری دنیا بہادر خاں کے رہنے کے قابل نہ تھی۔ یہاں سقراط کو زہر کا پیالہ دیا جاتا ہے۔ عیسیٰ کو سولی پر چڑھایا جاتا ہے۔ بالآخر اسی دنیا نے بہادر خاں کو حقہ پیش کر دیا۔ انسان اپنی حیوانی روایت پر پورا اترا لیکن خدا کے نیک بندے سے ایسا سلوک دعویداران انسانیت کو مہنگا پڑا۔ اس کی جاگیر کیا کی ساری ریاست چھن گئی۔ ہم اس کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے۔

لیڈر تو ممکن ہے مل جائیں، آتش نوا خطیب بھی شائد پیدا ہو جائیں لیکن ایسا انسان کہاں سے آئے گا؟

مگر کہا جاتا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ رو کر یہ اعلان کرتا ہے کہ ابھی خدا انسان سے مایوس نہیں ہوا ہے!

(ماخوذ از: ہفتہ وار شعور، قائد ملت نمبر ۱۹۶۴ء)

○○○○○

سید محمد مصلح الدین سعدی

علامہ اقبال اور قائد ملّت

ایک شاعر ایک خطیب۔ اسلامی نظریہ فن کی روشنی میں

مطالعہ اقبال کا حق اُس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک اُن شخصیتوں کو بھی مطالعہ کا موضوع نہ بنایا جائے جو اقبال سے راست متاثر رہی ہیں۔ اقبال کی معنویت کی علمبردار ان شخصیتوں میں سارے عالم اسلام کی کئی اہم شخصیتیں شامل ہیں۔ عالم اسلام کے علاوہ وہ لوگ بھی اقبال سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں جو حرکت و انقلاب اور تغیر و تبدل کو اس کائنات میں حیات انسانی کے ارتقاء کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ لیکن ان ساری شخصیتوں میں قائد ملت نواب بہادر یار جنگ کو نہ صرف یہ تقدم زمانی بھی حاصل ہے بلکہ استحکام ایمانی کے لحاظ سے اقبال کے تصور مرد مومن کی جھلک سب سے نمایاں ان کی ذات میں ملتی ہے۔ مرد مومن اقبال کا مثالی انسان جو کارگاہ حیات میں خدا کے آخری پیغام کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے آمادۂ جہاد ہو ——— بہادر یار جنگ تاریخ کے ایک تشکیلی دور میں مرد مومن کی ان خصوصیات کے ساتھ ہندوستان کے اُفق پر نمودار ہوتے ہیں۔

قائد ملّت ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ سارے عالم اسلام کے لئے ایک شدید کرب اور ابتلاء کا دور ہے ——— دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی استعمار اپنے عروج کے آخری دور میں ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ''فکر اقبال'' کے پھلنے اور پھولنے کا زمانہ بھی یہی ہے۔ ۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں اُن کی واپسی ہوتی ہے۔ یورپ کے مشاہدات نے علامہ اقبال میں بڑی معنی خیز تبدیلی کر دی تھی۔ وہ مشرق اور مغرب کے نظریہ ہائے حیات کا بڑی دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد سارے عالم انسانی کے لئے اسلام کو ایک

بہترین نظام حیات کے طور پر قبول کر چکے تھے۔ وہ جدید و قدیم کی اس کشمکش کو ایک دوسرے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔

۱۹۱۰ء میں اُن کے اضطراب اور تردد کا اندازہ اس تحریر سے ہو سکتا ہے۔

''۱۹۰۵ء میں جب میں انگلستان آیا تھا تو میں محسوس کر چکا تھا کہ مشرقی ادبیات اپنی ظاہری دلفریبیوں اور دل کشیوں کے باوجود اس روح سے خالی ہے جو انسان کے لئے اُمید ہمت اور جرأت عمل کا پیغام ہوتی ہے۔ جس کو زندگی کے جوش اور ولولہ سے تعبیر کرنا چاہیے' یہاں پہنچ کر یوروپی ادبیات پر نظر ڈالی تو وہ اگر چہ بہت افروز نظر آئیں لیکن اُن کے مقابلے کے لئے سائنس تھی جو اُن کو افسردہ بنا رہی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں جب میں انگلستان سے واپس آیا تو میرے نزدیک یورپی ادبیات کی حیثیت بھی تقریباً وہی تھی جو مشرقی ادبیات کی تھی۔ ان حالات سے میرے دل میں کشمکش پیدا ہوئی کہ ان ادبیات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنی چاہیے اور ان میں روح پیدا کرنے کے لئے کوئی نیا سرمایہ حیات فراہم کرنا چاہیے۔ میں اپنے وطن گیا تو یہ کشمکش میرے دل میں جاری تھی اور میں اس درجہ منہمک تھا کہ دو تین سال تک میرے عزیز دوستوں کو بھی علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ۱۹۱۰ء میں میری اندرونی کشمکش کا ایک حد تک خاتمہ ہو گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینا چاہیے۔ لیکن اندیشہ تھا کہ غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ بہر حال میں نے ۱۹۱۰ء میں اپنے خیالات کو مد نظر رکھ کر اپنی مثنوی اسرار خودی لکھنی شروع کی''۔ فکر اقبال پر شباب آ رہا تھا اور اودھر دکن میں نواب نصیب یار جنگ کے گھر جنم لینے والا محمد بہادر خاں اپنی بلوغت کی منزلوں میں داخل ہو رہا تھا۔

محمد بہادر خاں کو اُن کے والد نے اُس وقت کے ایک جید عالم صاحب دل بزرگ حضرت سید مخشی کے سپرد اس غرض سے کیا کہ وہ اس نہال تازہ کی تربیت و نگہداشت کی ذمہ داری قبول کریں۔ اس فقیر بے نوا نے جاہ و حشمت اور تمول کے ماحول سے آئے ہوئے گل سر سبد کو بوریا نشینی اور فقیری کی چاٹ لگا دی۔ مردم شناس نگاہوں کی تابانی نے غضب ڈھایا........'' کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر'' محمد بہادر خاں کی اٹھان غضب کی اٹھان تھی...... مدرسہ میں' پریڈ کے میدان میں' میلاد کے جلسے میں' جاگیر کے انتظام اور مالی نظم و نسق میں' تدبر سلیقہ' ہنر مندی اور ڈسپلن کی مثال قائم ہو گئی ...... ان کے والد نے ہزاروں روپیوں کا قرض چھوڑا تھا......

محمد بہادر خاں جیسے ہی صاحب نصاب ہوئے ان کو فرض حج کی تکمیل کا خیال ستانے لگا چنانچہ اسباب درست کر کے حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوئے — بعد فراغت حج مقامات مقدسہ کی زیارت کا عزم کیا اس طرح اس نوجوان کو جوانی میں عالم اسلام کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا — محمد بہادر خاں کی زندگی میں یہ سفر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی حیات کی تشکیل میں یہ ایک اہم سنگ میل ہے۔

محمد بہادر خاں نے اس وقت تک زندگی کے نشیب و فراز طے کرتے ہوئے اپنی عمر کی ۲۶ منزلیں مکمل کر لی تھیں۔ ۲۶/۲۵ برس کا کڑیل نوجوان نہ صرف یہ کہ حیدر آباد کے جاگیر شاہی ماحول کے اسرار و رموز سے واقف ہو چکا تھا بلکہ اپنی سیاحت بلادِ اسلامیہ کی وجہ سے جہاں دیدہ بھی ہو گیا تھا۔ جناب نذیر الدین احمد جنہوں نے ''سفر نامہ بلاد اسلامیہ'' مرتب کر کے شائع کیا ہے، لکھتے ہیں۔

''اس سفر کے دوران نواب بہادر یار جنگ نے سربراہان حکومت، رہنمایان ملت اور بادشاہان وقت سے ملاقاتیں کیں — برِ اعظم ایشیا کے انتہائی جنوبی گوشہ کا یہ سیاح جس کے قلب کی گہرائیوں میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی تمنا مچل رہی تھی اور عالم اسلام کے باہمی اتحاد کا تصور اسکے قوائے عمل کو جنبش دے رہا تھا۔ سفر کے دوران والئی حجاز' مصر' ترکی' ایران اور افغانستان کے اکابر مشاہیر سے اہم مسائل پر گفتگو فرمائی۔''

یہ سفر نامہ اس دور کی سیاسی مذہبی اور معاشرتی زندگی کی سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ قائد ملت کی نظر کی گہرائی ان کا تجسس اور شوق بے تاب اس کے ایک ایک جملہ سے آشکار ہے۔ ۱۹۳۱ء تک محمد بہادر خاں کی فکر میں پختگی' نظر میں بلندی اور دل میں گہرائی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ مطالعہ انسان اور مطالعہ ء کائنات کے اہم گوشوں سے شناسائی حاصل کر چکے تھے۔ اُن کا مذاق عارفانہ تھا اور مزاج شاعرانہ۔ فلسفہ مذہب اور شاعری زندگی کی ابدی صداقتوں کی کھوج میں ازل سے مصروف ہیں۔ محمد بہادر خاں کے قلب گداز نے اپنی ذات کی خلوتوں کو آراستہ کرنے کے شوق میں ماحول کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کیں۔ بلکہ وہ اپنی ذات سے انجمن آرائی اور نگہدار خودی کے قائل ہو گئے۔ عالم اسلام کے کرب و اضطراب کو تصادم و کشاکش کا رخ دینے کے لئے اُن کا دل بھی بے چین ہو گیا — علامہ اقبال اور محمد بہادر خاں کے حالات

میں اور ماحول میں کئی اعتبار سے فرق موجود ہے لیکن غم ملت اور غم انسان تک رسائی ان دونوں حضرات نے شخصی اظہار کے وسیلہ سے اپنی یافت کے ذریعہ حاصل کی اور اپنی پہچان و شناخت کے لئے قرآن و حدیث کے معیار سامنے رکھے۔ زمانہ کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا اور اپنی تربیت و نگہداری پر سب کاموں سے زیادہ توجہ دی۔ تاکہ ان کی پسند اور حق کا معیار بن جائے۔ خوب و ناخوب کے مروجہ معیاروں کے مطابق خود کو ڈھالنے کے بجائے ''معیارِ حق'' کو نصب العین بنایا اور اپنے تشخص کے لئے نہیں بلکہ اپنے نصب العین کے تشخص کے لئے اپنی صلاحیتوں کو آپ نے عصر کے آگے جاں بازی کے ساتھ پیش کیا۔

علامہ اقبال زندگی بھر ملت اسلامیہ کی سربلندی کی تمنا لئے اس راستے میں پیدا ہونے والی مشکلات کا حل ڈھونڈتے رہے اور اسی ملت کے لئے اپنی تلاش و جستجو کی روداد اپنے فکر و فن کی شکل میں چھوڑ کر رخصت ہو گئے اور قائد ملت نواب بہادر یار جنگ نے اس پوری روداد سفر کو نہ صرف یہ غور سے پڑھا بلکہ اُس تمنا کی عملی صورت گری کے لئے سرگرم رہے اور اقبال کے فکر و فن کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کے لئے اقبال کی معنویت کو اپنے عصر میں یوں پیش کیا کہ فکر اقبال کے بہت سارے گوشے نمایاں ہو کر سامنے آ گئے۔ ان دونوں میں وہی تعلق ہے جو نظریہ ساز اور نظریہ کو عملی طور پر نافذ کرنے والے میں ہو سکتا ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر اور حکیم دوسرا بہترین مفکر اور خطیب۔ شاعری اور خطابت دونوں تخلیقی عمل ہیں۔ دونوں ایک بڑی شخصیت کے طالب ہیں۔ شخصیت مستحکم ہو تو اسلوب اور انفرادیت وجود میں آتے ہیں۔ شخصیت اپنا اظہار بھی چاہتی ہے اور اپنے اظہار کا ایک مقصد بھی رکھتی ہے میرے نزدیک شخصیت نصب العین یا مقصد کے بغیر شخصیت ہی نہیں ہو گی یہ تصورات یا سرزمین خواب کی رومانوی، لازوال غیر مادی کوئی معروض شے نہیں ہوتی بلکہ ایک خاص زمان کی پابند اُس کی مقتضیات کی نگران اور پیش نظر مسائل کا اپنے پاس ایک حل رکھتی ہے۔

علامہ اقبال کی زندگی میں تبدیلی یا انقلاب کی طرف پہلا قدم اُن کی سیاحت یورپ کے بعد ہی اٹھتا ہے۔ اور یہی حال قائد ملت کی زندگی کا بھی ہے۔ یہ انقلاب سیاحت بلاد عرب کے بعد ہی آیا۔ اپنے عصر کی کامل واقفیت اور آگہی کے بغیر نہ ضرب کلیم ممکن ہے اور نہ عصائے کلیمی ہاتھ آ سکتا ہے۔ عذاب دانش حاضر سے باخبری اس کٹھن منزل کے اولین مراحل میں سے ہے جو

اس آگ سے مثلِ خلیل کامیاب و کامران نکل سکتا ہے وہی اپنے جلیل مقاصد کی تکمیل کے لئے کمر باندھ سکتا ہے۔ اقبال نے تو صاف اعلان کیا تھا۔

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ اس کی آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

اسی تجربے کے بعد اقبال ایک قدم آگے بڑھ کر امکانات کے نئے افق پیش کرتے ہیں۔

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اقبال حاضر و موجود کے گرفتار نہیں بلکہ اُس کے پارکھ ہیں۔ وہ قرآن اور حدیث نبوی ﷺ کی کسوٹی پر اس کو آنکتے ہیں۔ وہ انسان کی سرشت اس کے مقصد تخلیق اور کائنات سے اس کے ربط و تعلق کو ہی موضوع فکر نہیں بناتے بلکہ وہ انسان کی اندرونی کائنات کو بھی اپنے عصر کے پس منظر میں غور و خوض کا محور بناتے ہیں۔ وہ انسانی قابلیات انسانی عظمت اور کائنات میں اُس کے مقام کو متعین کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں یہ کائنات ابھی ناتمام ہے اور صدائے "کُن فیکون" کی گونج میں انسان خدا کے مقاصد کی تکمیل میں سرگرم عمل ہے۔ وہ کارِ خدائی میں شریک ہے نیابت اور خلافت الٰہی اس کا منصب ہے...... ابلیس سے اُس کی حریفانہ چشمک ہے۔ اقبال کی نظر میں انسان کی سب سے بڑی متاع اُس کی نظر ہے۔ جب وہ مقام نظر پر فائز المرام ہو جاتا ہے تو ایک آرزو جو اس نظر کی آفریدہ ہوتی ہے پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس آرزو کی تکمیل کے لئے کشمکش و تصادم کی منزلوں سے گذرتا ہے۔ یہ کشمکش و تصادم اس انقلاب آفریں شخصیت کی کارگاہ ہے۔ جو قرآن کا مقصود و مطلوب ہے۔ جو نمونہ ہے سرکار رسالت مآب ﷺ کی زندگی کا...... فردکی یہ تبدیلی اُس کی خودی کی نشو و نما صرف اُس زندگی تک محدود نہیں رہتی بلکہ

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

کا مصداق بن جاتی ہے۔ فرد اپنے تخلیقی عمل کے پیکر تراشتا ہے۔ یہ پیکر نئے جہانوں کی آفریدہ ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اقبال نے خطبات میں بہت ہی نادر نکتہ بیان کیا ہے۔ جس سے اقبال شناسی میں مدد ملتی ہے۔

''مری شخصیت کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے آپ شئے سمجھیں میں شئے نہیں عمل ہوں۔ مرے محسوسات و مدرکات کیا ہیں اعمال و افعال کا وہ سلسلہ جن میں ہر عمل دوسرے پر دلالت کرتا ہے اور جو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں تو اس لئے کہ اُن میں کوئی رہنما مقصد کام کر رہا ہے۔ مری ساری حقیقت مرے اس رویے میں پوشیدہ ہے کہ میں کوئی شئے نہیں کہ آپ شئے مکانی کی طرح مرا ادراک کریں۔ یا بہ ترتیب زمانی واردات کے ایک مجموعہ کی طرح میرا جائزہ لیں۔ آپ اگر سچ مچ مجھ کو جاننا چاہتے ہیں تو آپ کو مجھے دیکھنا ہوگا۔ آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ جب میں کسی شئے پر حکم لگاتا ہوں یا کوئی ارادہ کرتا ہوں تو اس میں مرا رویہ کیا ہوتا ہے۔ مرے مقاصد کیا ہیں؟ مری تمنائیں کیا ہیں؟ یوں آپ مری ذات کی تر جمانی کریں گے تو مجھے سمجھیں گے اور جان لیں گے ''

اقبال اور قائد ملت دونوں اس معیار نقد پر پورے اترتے ہیں۔ ان کی مثال دریا کے بہاؤ پر بہنے والے تنکے کی نہیں ہے بلکہ اُس تنکے کی ہے جو اپنے وجود کو اپنے ارادہ اور عمل سے منواتا ہے اور دریا کے بہاؤ کو کاٹ کر اپنی سمت و راہ کا تعین کرتا ہے۔ یہ صرف تخلیقی فعالیت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ تخلیقی شخصیت اپنے تار و پود میں فن کا ایک نظریہ رکھتی ہے۔ محمد بہادر خاں کی خطابت اور علامہ اقبال کی شاعری ان کی اچھی مثالیں ہیں۔ اقبال کی شاعری ہر گز اُن کے شاعرانہ کمال کے اظہار تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کا مقصود و منتہی کچھ اور تھا بہادر خاں کی خطابت کا بھی ہر گز مطلب یہ نہیں تھا کہ دنیا انہیں ایک عظیم المرتبت خطیب جس کے ہاں خوبصورت زبان مردانہ لہجہ باوقار اسلوب اور تیز فتار دریا کی روانی ہو تسلیم کر لیا جائے۔ یہ دونوں شخصیتیں فن کی سطح پر ایک فن کار کی شخصیت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ جی ہاں فن جس کے متعلق اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے۔ سائنس فلسفہ مذہب سب کے حدود ہیں صرف فن لامحدود ہے۔ یہ بات بظاہر بڑی ہی عجیب نظر آتی ہے۔ اس لئے ان دونوں تخلیقی شخصیتوں کے پیچھے جو نظریہ فن رواں دواں ہے اُس کا بھی جائزہ لے لیں۔

(ماخوذ از اقبال ریویو۔ ''اقبالیات سعدی'' خصوصی شمارہ اپریل ۲۰۰۳ء
ناشر اقبال اکیڈمی حیدر آباد)

○○○○

مولانا غلام محمد

بہادر یار جنگ یا متشکل فکر اقبال

(مولانا غلام محمد، نواب بہادر یار جنگ کے سوانح نگار ہیں۔ نواب صاحب کے علاوہ آپ نے مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا سلیمان ندوی کی سوانحات بھی لکھی ہیں۔ نواب صاحب سے مولانا کی عقیدت و محبت ان کے حسب ذیل مضمون کی ہر سطر سے عیاں ہے)

فکر پاکیزہ ہو یا معصیت آلودہ، پیام دینی ہو یا لادینی، اپنے عملی اظہار اور غلبہ کے لئے وہ ہمیشہ شخصی تشکل کا محتاج رہا ہے۔ مارکسیت روسیوں میں اس وقت تک نفوذ نہ کر سکی جب تک کہ اس کو لینن کا شخصی تشکل حاصل نہ ہوا۔ البتہ ناتسیت فوراً انقلاب انگیز اس لئے ہو گئی کہ ہٹلر خود ہی ناتسی فکر کا عملی پیکر بھی تھا۔ خود ہدایت ربانی اور فکر ایمانی بھی اسی لئے نہایت سریع النفوذ اور انقلاب آفریں رہی ہے کہ جس لمحہ وہ انسانی ہاتھ میں مکتوب ہو کر پہنچی ہے ٹھیک اسی لمحے دیکھنے والے کی نگاہ کے سامنے نبی اور رسول کا شخصی تشکل ایک پیکر نور بن کر موجود رہا ہے۔ نبی کا وجود فکر ایمانی کا وہ اثر انگیز اور جاذب قلب و نظر تشخص ہوتا ہے جس کے ہوتے اہل امت کی عقل تعبیر فکر کی پراگندگی سے محفوظ رہتی ہے اور وہ یقین واثق کے ساتھ عملی اقدام پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

غیر منقسم ہندوستان میں ہمارے دور غلامی کا خاتمہ بھی ایک صحیح اسلامی فکر کا رہین منت ہے اور ہندی مسلمان کو یہ فکر حکیم مشرق علامہ شیخ محمد اقبال نے دی، مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ خود اپنے فکر کے عملی ترجمان نہ تھے، جس کا کھلے بندوں اعتراف انھوں نے کیا ہے۔

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

اقبال کے شاگرد خاص ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے اپنے مضمون ''اقبال کی زندگی'' میں سلسلہ کا ایک واضح تر لطیفہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مولانا محمد علی نے اقبال سے یہی کہا تم نے ہم کو

عمل کی دعوت دی لیکن خود بے عمل ہی رہے) اقبال نے جواب دیا سنو بھائی تم نے دیکھا ہوگا کہ جب قوالی ہوتی ہے قوال بڑے مزے اور اطمینان سے گاتا ہے لیکن سننے والے بوجد کرتے ہیں وجد میں آتے ہیں لیکن اگر یہی کیفیتیں قوال پر بھی طاری ہو تو قوالی ختم ہو جائے۔ آگے خلیفہ صاحب لکھتے ہیں۔ اس بیان میں اقبال نے بڑے ظریفانہ انداز میں ایک بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جس طرح فطرت میں تقسیم عمل ہے اسی طرح افراد میں بھی یہ بات ماننی پڑتی ہے۔ وہ جس فکر کو پیش کر رہے تھے اس کا تشخص ان کی ذات میں موجود نہ تھا اور جیسے کہ تمہید میں بتایا جا چکا 'فکر اس وقت تک بے اثر رہتی ہے جب تک کہ اس کا عملی پیکر انسانی نگاہ کے سامنے آ نہ جائے چنانچہ فکر اقبال بھی ابتداً انقلاب انگیز نہ ہو سکی مگر چونکہ حکیم مشرق میں اخلاص تھا ملت کا سوز و درد ان کو بے قرار کئے ہوئے تھا، اہل اسلام کی بلندی کے وہ دل و جان سے خواہاں تھے، اس لئے ان کی فکر بارگاہ ربوبیت میں مقبول ہوئی اور قدرت نے اس کے تشکل کا سامان کر دیا اور جس طرح مطلع مشرق سے ابھرنے والے آفتاب کی روشنی اپنا اولین تعین بہت دور مغربی افق پر کرتی ہے اسی پر طرح شمال مغربی ہند سے ابھرنے والی فکر نے اپنا پہلا تعین کافی دور قلب دکن کے ارتفاع پر کیا جو مسلم عہد مغلیہ کی حریت کا آخری مرکز تھا' یہاں فکر اقبال کو ایک موزوں قالب مل گیا جس کو ہم بہادر یار جنگ کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں، اس تشخص کو پا کر فکر اقبال ہندی مسلمانوں کے سامنے متشکل ہو کر آ گئی اور شنیدہ کو دیدہ پا کر یکا یک مسلمانان ہند میں ذوق انقلاب پیدا ہو گیا یہ کوئی شاعرانہ تعبیر نہیں بلکہ ایک ٹھوس تاریخی حقیقت ہے۔

دیکھئے علامہ اقبال کی اصل شاعری کا آغاز ۱۹۰۸ء کے بعد سے ہوتا ہے جب وہ دیار غرب کا مشاہدہ اور معائنہ کر کے ہندوستان واپس آئے تھے اس سفر سے واپسی کے بعد اقبال نے کچھ عرصہ پروفیسری کی۔ پھر بیرسٹری کا پیشہ اختیار کیا اور اسی دوران اپنی فکر کو وہ شاعرانہ پیرایہ میں جستہ جستہ پیش کرنے لگے' مگر مرتب صورت میں ان کی فکر پہلی بار ۱۹۱۵ء میں پیش ہو سکی جو ''اسرار خودی'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔ اب قدرت کی کرشمہ سامانی دیکھئے کہ ادھر شمالی مغربی ہند سے یہ فکر ابھری ادھر ناف جنوب کے شہر حیدرآباد میں اس کے تشکل کا سامان ہو رہا تھا۔ بلدہ حیدرآباد کے ایک سیر چشم، غیور اور مجاہد خانوادہ میں ۱۹۰۵ء میں محمد بہادر خاں پیدا ہوتے ہیں ذہانت، وفطانت، فکر ونظر، صداقت وامانت، جرات وہمت اور للّٰہیت وایثار نفس کی بے پناہ

صلاحیتیں لئے ہوئے، سراپا محبوبیت اور ذاتی واکتسابی نفوذ کی اپنی آپ مثال! بہادر یار جنگ کا نمود سمائی بھی اور دماغی بھی عام بچوں سے تیز تر رہا، نوجوانی میں باپ کی رحلت نے اسٹیٹ کی ساری ذمہ داری ان پر ڈالدی۔ اور اس نو عمر نے ناتجربہ کاری میں حسن انتظام کی داد حاصل کرلی اور ایک مقروض جاگیر کو باسرمایہ جاگیر کے رتبہ تک پہنچادیا۔ ۱۹۳۱ء میں بہادر یار جنگ نے حج کا فریضہ ادا کر کے سارے بلاد اسلامیہ کی سیاحت شروع کی۔ ملت اسلامیہ کی حالت کا غائر مطالعہ کیا، حجاز ومصر، شام وعراق، ترکی، فلسطین اور ایران وافغانستان کے پختہ فکر رہنمایان ملت پر اپنی بیدار مغزی کی ژرف نگاہی اور دیدہ وری کا سکہ جمایا۔ سفر ختم کر کے یہ ۲۶ سالہ ابن بطوطہ ثانی جب اپنے وطن واپس آیا تو ۱۹۳۲ء میں فکر اقبال اس کے سامنے آئی اور اس طرح آئی گویا وہ اسی کی متلاشی تھی۔ بہادر یار جنگ نے اس سے انس پایا اس کو اپنے اندر جذب کرلیا اس طرح فکر اقبال کو ایک صحیح اور کامل تشکل مل گیا۔ حکمت اقبال کی جیتی جاگتی تعبیر نگاہوں کے سامنے آگئی۔ اب جو بہادر یار جنگ نے قائد ملت بن کر قوم کو ''از خواب گراں خواب گراں خیز'' کی للکار سنائی تو اہل غفلت چونک اٹھے اور دفعۃً مسلم قوم میں فکر اقبال کی بنیاد پر ایک انقلاب بپا ہوگیا۔ مردوں میں جان پڑگئی پراگندہ متحد ہوگئے ان میں مقصدیت کا شعور اور منزل کا ہوش پیدا ہوگیا اور وہ اپنی قوم میں انفرادیت کے قیام کے لئے غیر متزلزل عزم کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ سن وسال کی یہ تاریخ شہادت اگر بالفرض میسر نہ بھی آئی تب بھی ارباب فہم ودانش سے یہ پوچھنے کا حق تو رہتا ہی اور اب بھی حاصل ہے کہ وہ انصاف سے بتلائیں کہ فکر اقبال کا عملی تعین تشخص اور تشکل نہ صرف ہندوستان میں بلکہ سارے عالم میں جہاں جہاں تک بھی وہ پھیلی اور پہنچی ہے بہادر یار جنگ کی مقناطیسی اور ڈائنامک مومن شخصیت کے سوا کہیں اور دکھلایا جاسکتا ہے؟ اگر ہے تو کوئی دکھلائے! اقبال کا تصور مرد مومن، اس کا نظریہ قلندر اور اس کی تمثیل شاہین کا مصداق اگر کوئی اور ہوسکے تو نام لے کر کوئی بتلادے! ڈھونڈنے والی نگاہ تھک کر عاجز وقاصر رہ جائے گی مگر بہادر یار جنگ کے سوا کوئی اور نہ مل سکے گا۔ جن خوش بختوں نے محض قائد ملت یا لسان الامت بلکہ بہادر یار جنگ کی مجموعی شخصیت (personality) کو قریب سے دیکھا ان کو اقبال کے فلسفہ خودی یا تصور مرد مومن کے سمجھنے میں کوئی تردد باقی نہیں رہ گیا۔

مے لقائے تو جواب ہر سوال

ورنہ شارحین اقبال کی پراگندہ تعبیریں ایک طالب علم کو کوئی یقینی اور معتبر تصور فکر اقبال کا نہ عطا کر سکی ہیں نہ کبھی کر سکیں گی۔

جن لوگوں نے بہادر یار جنگ کو دیکھا نہیں اب انھیں کس طرح یقین دلایا جائے کہ جب کبھی ان کی دلفریب ولربا شخصیت پر نظر پڑتی تھی یا آج بھی اگر وہ تصور میں آجاتے ہیں تو حکیم مشرق کا کلام گویا مجسم ہو کر نگاہوں میں آجاتا ہے اور ان کی ایک ایک ادا پر، ہر ہر اظہار عزم پر اور نو بہ نو اقدام عمل پر اقبال کے اشعار اور قطعات بے ساختہ زبان پر آجاتے تھے ان کا پُر شکوہ قالب اور ملت کی زبوں حالی پر پگھل پگھل جانے والا دل جب نگاہ کے سامنے ہوتا تھا تو شاعر مشرق کا یہ بے نظیر قطعہ زبان پر آجاتا اور خود اپنے دل میں جرات عزم عمل کی ایسی پُر قوت اکساہٹ پیدا کر جاتا تھا کہ جو ہزار پند و وعظ سے پیدا ہونا دشوار ہے

تنے پیدا کن از مشت غبارے　　　تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درون او دل درد آشنائے　　　چو جوئے در کنار کوہسارے

راقم عاجز نے بہادر یار جنگ سے کبھی پوچھا نہیں کہ پچھلی رات کو وہ اپنے مولیٰ سے کس وقت سرگرم راز و نیاز ہو جایا کرتے تھے۔ پر اتنا مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اس معاملہ میں اچھے اچھے دینداروں سے زیادہ چست و چوکس تھے۔ اس کا اندازہ ان کے صبح کے روز آنہ معمولات سے ہوتا ہے کہ وہ آہ سحر گاہی سے فارغ ہو کر قرآن پاک کی تفاسیر کا مطالعہ تقریباً ایک گھنٹہ کرتے اور پھر نماز فجر کے لئے مسجد تشریف لاتے اور بعد نماز حاضرین کو درس قرآن سے فیضیاب فرماتے تھے۔ ان کے ذوق خلوت اور نالہ نیم شبی کا اندازہ اور بزدلوں اور پست ہمتوں کو اپنے استغنائے عمل سے جتلایا کہ۔

دل بے باک را ضرغام رنگ است　　　دل ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحرا است　　　وگر ترسی بہر موجش نہنگ است

اور چلئے ملت اسلامیہ ہند میں یوں آنے کو کتنے منصب قیادت پر آئے اور آج ہند و پاک میں نہیں عالم اسلام میں کتنے ہیں جو آئے ہیں اور آتے رہیں گے مگر مومنانہ قیادت اور اس کی ظاہری و باطنی فکری و عملی جامعیت کا جو تصور حکیم مشرق نے پیش کیا تھا اس کا کامل تشکل بہادر یار جنگ کی ذات کے سوا اور کہاں دیکھا جا سکا، وہی اور صرف وہی اس مومنانہ قیادت کے تصور کا

حسین پیکر تھے۔ جو اقبال کے لفظوں میں یوں پیش ہوا ہے۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے

اور سنئے! علامہ اقبال نے فرنگی تہذیب وتمدن پر کیسی کیسی کاری ضربیں لگائیں، مسلمانوں کو تقلید غیر سے بچنے کی کس شدت سے تاکید فرمائی اور اپنے ورثہ اسلامی کی قدر شناسی کی کتنی پرزور تلقین کی لیکن اس وقت سے آج تک زمرہ قیادت میں اس پیام اقبال کا تشخص اور تشکل بہادر یار جنگ کی ذات کے سوا کہیں نظر بھی آیا؟ وہی ایک شخصیت ایسی تھی جس کے عمل سے دینی غیرت، ملی حمیت اور مغربیت سے تنفر نہ صرف عیاں تھا بلکہ اس کو دیکھ کر ان اقدار کا عملی نفوذ لوگوں میں سرایت کر جاتا تھا اور اقبال کے اس قطعہ کے پڑھنے میں ایک روحانی کیف محسوس ہوتا تھا۔

دلا نارائی پروانہ تا کے نگیری شیوہ مردانہ تا کے
یکے خود را بہ سوز خویشتن سوز طواف آتش بیگانہ تا کے

غرض مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں ہاتھ میں کام اقبال تھائے اور نگاہ میں جمال بہادر یار جنگ اور پھر اس کو پڑھتے جایئے اور اس کو دیکھتے جایئے۔ آپ خود کہہ اٹھیں گے کہ یہ بہادر یار جنگ ہیں یا متشکل فکر اقبال؟

یہ متشکل فکر اقبال ''جب تک زندہ و تابندہ رہی' ہر جگہ روح اقبال کارفرما رہی۔ علامہ اقبال قوم کو اپنا پیام دے کر ۱۹۳۸ء میں رحلت فرما گئے مگر چونکہ ان کی ذات میں ان کی فکر کا تشکل تھا۔ اس لئے ملت اسلامیہ ہند کو ان کی رحلت کا نقصان کچھ ایسا محسوس نہ ہوا کلام اقبال اور پیام اقبال پورے آب وتاب سے قوم میں کارفرما رہا مگر آہ کہ ۲۵ر جون ۱۹۴۴ء کو اس کا ''تشکل'' یعنی بہادر یار جنگ

مردِ حق افسون ایں دیر کہن
از دو حرف ربی الاعلیٰ شکن

کا نعرہ لگا کر ملا اعلیٰ کی طرف پرواز کر گیا۔ اس سے انکار نہیں کہ اقبال کے نام کا کوئی ادارہ یا اکیڈیمی آج بھی قائم ہے اور قائم رہے گی، یوم اقبال بھی سال بہ سال منایا جاتا رہے گا اس کے اشعار بھی سیاسی جماعتیں موقع بہ موقع اپنے نعروں میں قوت پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتی

رہیں گی وہ بھی جو نام نہاد اسلام کی مدعی ہیں اور وہ بھی جو اشتراکی نظام حیات کی ترویج چاہتی ہیں۔ اقبال کے فلسفہ خودی اور تصور مرد مومن پر سیکڑوں صفحات سیاہ کئے جا چکے اور اب بھی کئے جائیں گے مگر کاغذی ناؤ کے تراکی ہے جو اب مسلم قوم کو ترائیگی' زندگی کے سمندر میں تصور اقبال کی عملی ناؤ چلا کر جس نے دکھا دی تھی وہ نا خدا اب واصل بہ خدا ہو چکا' ہزار رحمتیں اس پر اور ہزار سوگ فکر اقبال کا جو بہادر یار جنگ کو کھو کر ایک ''حدیث ماتم دلبری بن کر رہ گئی!!

اس کا اظہار ان کے اس موثر اور لاجواب جملہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔ ''جو لوگ راتوں کو رونا نہیں جانتے' دن کو ان کی ہنسی بیماروں کی سی ہنسی معلوم ہوتی ہے!'' بہادر یار جنگ کی سیرت کا یہ پہلو اقبال کے ان حقیقت افروز اشعار کا کس قدر پر تاثیر تشکل لئے ہوئے ہے۔

بے آہ سحر گاہی تقویم خودی مشکل
یہ لالہ پیکانی خوشتر ہے کنار جو

اور یہ کہ ؎

عطار ہو' رومی ہو' رازی ہو' غزالی ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحرگاہی
دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولی — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

بہادر یار جنگ اقبال کے ''تصور شاہین'' کا جیتا جاگتا شخص تھے' ان کو اپنے اجداد سے رزق وافر کا جو سامان ملا تھا کہ اپنے وہ ملوک و سلاطین کی قصیدہ خوانی کا صلہ نہیں بلکہ مجاہدانہ کارناموں کا صلہ تھا۔ مرحوم کو بجا حق تھا کہ اپنے اجداد کے اس ورثہ سے پوری عزت نفس کے ساتھ فائدہ اٹھائیں اور انھوں نے اٹھایا مگر صرف اسی وقت جب تک یہ رزق ان کی بلند پروازی میں ابر سیاہ بن کر حائل نہیں ہوا' اور جب وہ حائل ہوتا نظر آیا انھوں نے جاگیر کو ٹھکرا دیا اور پھر تا دم آخر اس کی طرف نگاہ تک نہیں اٹھائی۔ اقبال کا یہ مصرعہ ع

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

کرنے کو تو کسی اور نے بھی اپنی ذات پر زور حکومت موزوں کرنا چاہا مگر وقت کے قاضی نے اس کے حق میں فیصلہ صادر نہیں کیا اس لئے کہ اس کی پرواز تو خود اس کے ہوس رزق نے چھین لی تھی چنانچہ اسی ہوس نے اس کو چاہ مذلت میں دھکیل بھی دیا۔ اس کا مصداق تو صرف

محمد بہادر خاں تھا جس نے اپنی آبائی جاگیر اور خطاب سرکاری کو مفاد ملت کی راہ میں بلا تامل ٹھکرا کر اپنی پرواز میں اور قوت پیدا کر لی اور کرگس صفتوں کو یہ عملی سبق پڑھایا کہ۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(ماخوذ از بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔ ناشر بہادر یار جنگ اکاڈمی کراچی مطبوعہ جون ۱۹۷۶ء ۲۵۰ تا ۲۵۶)

○○○○

○

مدینہ منورہ میں مقیم ایک بزرگ کے نام خط سے اقتباس: ''آپ بارگاہِ اقدس پر حاضر ہیں، کسی روز میرے لئے نماز فجر کے بعد جالی سے قریب کھڑے ہو جائیے اور عرض کیجئے کہ آپ کے جسم سے دور لیکن دل سے نزدیک غلام طاغوتی طاقتوں کے ساتھ اپنی بے سروسامانی کے باوجود برسرِ پیکار ہے زمانہ اس سے پھر جائے لیکن آپ کی نگاہِ لطف کے انحراف کو برداشت نہیں کر سکتا۔ بدر کے ساتھیوں کا صدقہ، اُحد کے میدان میں حمزہؓ ابن عبدالمطلب کا تصدق، زرہ چبھی ہوئی پیشانی کا واسطہ، اس کو اپنا سمجھئے اور اپنے سے قریب کر لیجئے۔

(مجید فاروقی۔ حوالہ ''بہادر یار جنگ اہل نظر کی نظر میں ص ۷۷)

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید

اقبال اور قائد ملت بہادر خان مرحوم

نامہ "اہل شعور" کا تقاضا ہے کہ اقبال اور قائد ملت کے عنوان سے خاص نمبر کے لئے کچھ سپرد قلم کروں۔ یہ حکایت لذیذ تر بھی ہے۔ اور دراز تر ہونے کا تقاضا کرتی ہے لیکن آج کل فرصت کار و بار شوق نہیں۔ اس لئے "تلقین درس اہل نظر یک اشارت است" کے مشورہ حافظ پر عمل کے لئے مجبور و معذور ہوں۔

اگرچہ قائد ملت کو بعض اسباب سے یونیورسٹی کی باضابطہ اعلیٰ تعلیم کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن ان کا دماغ فطرتاً اس کا طالب تھا اور دل اس اعلیٰ جذبہ کا حامل تھا۔ (اپنی بلند فطرت کی اس پیاس کو بجھانے کے لئے) انہوں نے بعض خاص ذرائع اختیار کئے تھے۔

اعلیٰ دینی علوم کی کتابیں وہ مشہور عالم و ادیب و پروفیسر مولانا شمسی صاحب مرحوم سے عرصہ تک پڑھتے رہے۔ حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی شاہکار تصنیف حجۃ اللہ البالغہ بھی انہوں نے شمسی صاحب مرحوم سے پڑھی تھی۔ مطالعہ کا انہیں بڑا ذوق تھا۔ ان کا ایک منتخب کتب خانہ تھا۔ اس کتب خانہ میں تفسیر، سیرت اور اقبال کی تصانیف کا ایک گنجینہ تھا۔ تفسیر کا مطالعہ خود کرتے اور اپنی ڈیوڑھی کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد میں تفسیر کا درس دیتے۔ سیرت کے جلسوں ہی سے انکی خطابت اور اس کی مقبولیت کی بنیاد پڑی۔

ان دنوں نواب فصاحت جنگ مرحوم کی دعوت پر ان کے بنگلہ میں سیرۃ النبیؐ کے ایک تقریب کے لئے حضرت مولانا سید سلیمان صاحب مرحوم مشہور سیرت نگار تشریف لائے۔ نواب بہادر یار جنگ نے پہلی ملاقات میں ان سے فرمایا کہ "میں آپ کا شاگرد ہوں"۔ مولانا سلیمان حیران ہوئے اتنا لمبا چوڑا اور وجیہ شاگرد رہا ہو اور میں کس طرح بھول گیا؟۔ اس حیرت کو

توڑنے کے لئے نواب صاحب مرحوم نے تشریح کی کہ میں آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے آپ کا شاگرد بنا ہوں خصوصاً سیرت پر آپ کے خطبات مدراس کے تو قائد ملت حافظ تھے۔ ہر سال مجالس سیرت کے سلسلہ میں اس کتاب کا بار بار مطالعہ فرماتے۔

اسی طرح ان کی فکر ونظر کا ایک سرچشمۂ شیریں کلام اقبالؒ تھا۔ اقبال کے کلام میں انہیں قلب ونظر کا ایک آئینہ مل گیا تھا۔ خود تصانیف اقبال بار بار پڑھتے تھے۔ ذوق اور حافظہ کی بدولت اکثر اشعار اقبال بہ زبان تھے۔ اپنی تقریروں میں نگینوں کی طرح انہیں جڑتے۔

وہ بیان فرماتے کہ ایک بار لاہور گئے اور اس کی انہیں بڑی تمنا تھی کہ وہ اقبال کو شعر کہتے ہوئے حال میں دیکھیں۔ خوش قسمتی سے وہ بہت سویرے آہ سحر خیزی کے وقت جاوید منزل پہونچ گئے۔ حسب عادت اقبال، تلاوت کر کے بعد شعر کہنے میں محو تھے۔ علی بخش مرحوم کی مدد سے نواب صاحب نہایت خاموشی سے ان کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ اقبال اپنے شعر گوئی اور گنگنانے میں محو تھے۔ جب یہ مشغلہ ختم ہوا تھا تو باہمی گفتگو ہوئی۔ یہ واقعہ ایک نمونہ اور علامت ہے کہ وہ اقبال اور کلام اقبال سے کس طرح دل بستگی رکھتے تھے۔

اس مطالعہ سے بھی ان کی تشنگی نہیں بجھتی تھی۔ آخر میں اہل ذوق کے مشورہ سے حلقہ اقبال کی بنیاد ڈالی۔ ان دنوں جمعہ کو تعطیل ہوتی تھی۔ جمعہ کے دن عصر سے مغرب تک یہ بزم آراستہ ہوتی۔ چائے یا شربت کے دور کے بعد اس کا آغاز ہوتا۔ حیدرآباد میں بفضل خدا اقبال شناسوں اور ماہرین کلام اقبال ایک ممتاز ومنتخب گروہ تھا۔ قائد ملت کی ذات اس کشش کا مرکز ثقل تھے۔ ڈاکٹر رضی الدین، رومی اور اقبال سے بڑی گہری دلچسپی رکھتے۔ یوم اقبال کے موقع پر ایک عالمانہ خطبہ پڑھتے ''اقبال موت اور حیات''، ''اقبال حضور باری میں'' جیسے اہم مقالات انہوں نے سپرد قلم فرمائے۔ ان کے اقبال کے موضوع پر مقالات کا شاہکار میری رائے میں ''اقبال کا تصور زماں'' ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ''روح اقبال'' اپنے پہلوؤں پر اپنے مطالعہ کا نچوڑ انہوں نے ''روح اقبال'' میں پیش کیا ہے۔ سید عبدالواحد ناظم جنگلات بھی ان دنوں حیدرآباد میں تھے۔ جنہوں نے IQBAL'S ART AND

THOUGHT لکھی ہے۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صدر شعبہ فلسفہ بھی صاحب "رموز اقبال" ہو گئے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اقبال کے شاگرد اور کلام اقبال کے نکتہ شناس استاد تھے بعد میں "فکر اقبال" کے وہ مصنف ہو گئے۔ ——— لیکن آپ کی اس کتاب فکر اقبال سے بہت پہلے میں نے کلام اقبال کے بعض اہم اور نازک پہلوؤں پر اہل فکر و نظر کے مقالات منتخب کا ایک مجموعہ فکر اقبال کے نام سے شائع کیا تھا جو اس سیریز میں تیسری کتاب تھی۔ ہم میں اکثر اصحاب اس ہفتہ وار بزم اقبال میں شریک ہوتے تھے۔

نواب صاحب حتی الامکان خود شرکت کی کوشش فرماتے۔ پھر تو ایک مثالی مذاکرہ اور علمی مباحثہ رہتا۔

اس حلقہ میں کلام اقبال کا مطالعہ اور فکر اقبال کے تاریخی ترتیب سے شروع ہوا۔ پہلے اسرار خودی اور رموز بیخودی کا مطالعہ تدریجی ترتیب سے انجام کو پہونچا پھر جاوید نامہ کا مکمل بالاستیعاب درساً درساً تحقیقی مطالعہ تکمیل کو پہونچا۔ یہ سلسلہ ان کی زندگی کے آخری دن بھی جاری رہا۔ اتوار کا دن تھا۔ رجب کی تیسری تاریخ تھی۔ عصر کے بعد محفل جمع تھی۔ اس وقت "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق زیر" مطالعہ تھی۔ بیت الامت (دولت کدہ بہادر یار جنگ مرحوم) میں درس اقبال کی حکمت آموز اور دل سوز صحبت جاری تھی۔ حلقہ اقبال کے بانی اور حکمت اقبال کے شیدائی قائد ملت، لسان امت، جن کی سراپا جہاد زندگی خود درس اور اللہ بس باقی ہوس کے مصداق اپنی تہی کو پُر اور خزف کو زر کرنے والی شرکت سے اس میں۔

پختہ سازد صحبتش ہر خام را
تازہ غوغائے دہد ایام را

کا رنگ پیدا کر رہے تھے۔ جب میں اس مثنوی کی جلال آفریں نظم "حکمت کلیمی" کے اس شعر۔

مرد حق افسون این دیر کہن
از دو حرف ربی الاعلیٰ شکن

سے آگے بڑھنے لگا تو فرمایا "رشید صاحب! یہ مقامات جلد گذرنے کے نہیں!"
میں نے کہا "بہت خوب" آہ کسے خبر تھی کہ یہ مرد حق دو ایک گھنٹوں کے اندر اس دیر کہن

کے افسوں کو توڑتے ہوئے یہاں سے گذر جائے گا۔ اور کلام اقبال کا یہ پیکر عمل اپنے حریفانِ بادہ کو

غیرت اُو برنگیرد حکمِ غیر
قصرِ سلطاں درنگاہش کہنہ دیر

کے مظاہروں سے تا قیامت محروم کر دیگا۔

خدا بخشے بہت خوبیاں تھیں مرنے والے میں
(ماخوذ از ہفتہ وار ''شعور'' قائد ملت نمبر ۱۹۶۴ء)

○○○○○

○

مدیر نوائے وقت جناب حمید نظامی مرحوم کے ایک خط کے جواب میں۔

''یہ سن کر اقبال سے میری عقیدت بڑھ گئی کہ ان کے مطالعہ نے آپ کی بے یقینی کو یقین کے راستہ پر ڈال دیا۔ ایمان کی صحیح منزل جس سے آپ اپنے آپ کو محروم سمجھتے ہیں آپ زیادہ دور نہیں ہے۔ میں آنکھوں کے بہاؤ کو قلب کا غسل کہتا ہوں۔ خدا آپ کی اس رقت کو اور بڑھائے۔''

(نصر اللہ خاں۔ حوالہ ''بہادر جنگ اہل نظر کی نظر میں۔ ۱۲۹)

نظر حیدرآبادی

بہادر یار جنگؒ اور اقبال

بہادر خاں نے بہت کم عمر پائی تھی، ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے ۱۹۴۴ء میں اس فانی زندگی کے علائق سے چھٹ کر ایک غیر فانی زندگی سے ہم کنار ہو گئے یعنی اس چمن کے مقدر میں پوری چالیس بہاریں بھی نہیں لکھی تھیں، لیکن اس مختصر سی زندگی میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں ان کے ہاتھوں انجام پا گئے اسی تھوڑی سی مدت میں انہوں نے امارت کے آغوش میں پل کر اس کی کثافتوں سے نجات بھی حاصل کر لی۔ عالم اسلام کی سیاحت بھی کی اور حج بیت اللہ اور روضہ نبویؐ کی زیارت سے بھی مفتخر ہوئے۔ اور اس سیاحت کا حاصل ہندوستان آ کر اس طرح پیش کیا کہ خواجہ حسن نظامی کو لکھنا پڑا۔

'' موجودہ زمانے میں بہت سے مسلمانوں نے اسلامی ممالک کی سیر کی اور سفرنامے لکھے، جن میں سے ایک میں بھی ہوں اور مرحوم مولانا شبلی بھی ہیں اور محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار بھی ہیں اور بھوپال کے ایک مسلمان بھی ہیں جنہوں نے اسپین کا بہت اچھا سفرنامہ لکھا ہے اور مرحوم حافظ عبدالرحمٰن امرتسری بھی ہیں، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے ایک ہی وقت میں تمام اسلامی دنیا کے ملکوں اور قوموں کو دیکھا ہو اور معاشرتی مقاصد سامنے رکھ کر دیکھا۔ اس لحاظ سے نواب بہادر یار جنگ سب سیاحوں سے اعلیٰ ہیں۔''

اس سیاحت کے بعد تن آسانی سے اتنی سرگرانی بڑھی کہ جنگل جنگل کی خاک چھانی اور پانچ ہزار نفوس کو مشرف بہ اسلام کیا، سیاست کی دنیا میں قدم رکھا تو اپنی اصابت رائے، جوش خطابت اور خلوص کار کی وجہ سے اسلامیانِ ہند کی تمناؤں کے ترجمان اور امیدوں کے مرکز بن گئے چنانچہ عبدالماجد دریابادی کو اعتراف کرنا پڑا کہ

''ہندوستان نے اگر دوسرا محمد علی پیدا کیا ہوتا تو وہ یہی تھا، وہی اخلاص، وہی دینی

جوش، وہی تڑپ، وہی سوجھ بوجھ، وہی نبض شناسی، وہی ہمت وعزم، بجز محمد علی کی انگریزی انشاپردازی کے سب کچھ وہی۔''

شعروادب سے خلقی ربط رکھتے تھے اور بڑے خلیق انسان تھے۔ اسی لئے خلق تخلص اختیار کیا اور اپنی شعرفہمی اور سخن سنجی کا لوہا اس طرح منوایا کہ ان کے انتقال کے کئی برس بعد ''ستائش کی تمنا'' اور ''صلے کی پروا'' کیے بغیر رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی نے اپنے نئے مجموعہ کلام ''آتش گل'' کو ان الفاظ کے ساتھ ان کے نام سے معنون کیا۔

''میں اپنے اس مجموعہ کلام کو قائد ملت مولوی بہادر خان مرحوم سابق نواب بہادر یار جنگ کے نام نامی سے منسوب کرنا اپنا اخلاقی و ادبی فرض تصور کرتا ہوں، جو سراپا گداز، مجسم اخلاص فقید المثال مقرر، کامیاب مصلح، اپنے وقت کے عظیم المرتبت خطیب اور ایک جری انسان تھے۔ جن کے گفتار و کردار میں کوئی تضاد نہ تھا۔

وہ بیک وقت تمام محاسن شعری کا احاطہ کر لیتے تھے اور اچھے شعر سے اتنی شدت کے ساتھ متاثر ہوتے تھے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا کوئی دوسرا خوش مذاق نہیں دیکھا۔ خدائے رحمان و رحیم ان کی روح کو اپنا قرب خاص عطا فرمائے۔''

اسی شعرفہمی اور سخن سنجی نے ان کو پہلے پہلے فکر اقبال کا مرتبہ دان بنایا اور آخر آخر میں عارف ہندی ان کے مرشد معنوی بن گئے۔

اقبال سے بہادر یار جنگ کی ملاقاتوں اور روابط کی تفصیلات تو انہیں کے ساتھ دفن ہو گئیں اور مراسلات بھی انقلاب حیدرآباد کے وحشت ناک دور میں ضائع ہو گئے صرف ایک خط حاصل ہو سکا جو اقبال نے کشمیری مسلمانوں کی امداد کے سلسلہ میں ان کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا، یہ خط اسی کتاب کے حصہ مکتوبات میں شامل ہے۔ اس ایک خط کے مطالعہ سے بھی دونوں کے روابط کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔

گمان غالب یہ ہے کہ اقبال سے ان کی پہلی ملاقات ۱۹۲۹ء میں ہوئی ہوگی۔ کیونکہ یہ زمانہ بہادر خان کے سن شعور کا تھا اور وہ مہاراجہ کشن پرشاد کی محفلوں میں باقاعدہ اور بالالتزام شرکت کرنے لگے تھے، اقبال ۱۹۲۹ء میں دوسری بار حیدرآباد گئے تھے اور ان کے اعزاز میں

مہاراجہ نے بڑی شاندار دعوتیں کی تھیں اور ایک تاریخی مشاعرہ بھی منعقد کیا تھا، انہیں دعوتوں میں بہادر خاں اقبالؔ سے متعارف ہوئے ہوں گے۔ ایک اقدار اسلامی کے احیاء کا داعی تھا اور ایک خدمت اسلام کے جذبات سے سرشار، یہی وجہ تھی کہ دونوں کے مراسم میں استحکام پیدا ہوتا گیا اور آپس میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا، مشوروں اور مذاکروں کی صورت بھی پیدا ہوئی اور اس طرح ایک نکتہ رس کو ایک دانائے راز کی قربت کا شرف بھی حاصل ہو گیا اور اسی قربت نے بہادر خاں کو شان امارت سے بے نیاز اور سراپا ایثار مجسم عمل بنا دیا۔ اقبال سے ان کی ملاقاتوں کے سلسلہ میں ایک اشارہ وسا ان کی اس تقریر میں ملتا ہے جو انہوں نے اقبال کے جلسہ تعزیت میں کی تھی۔ فرماتے ہیں

> "میرے نالے فضائے حیدر آباد سے کچھ اس طرح نا آشنا ہو چکے تھے کہ مجھے یاد بھی نہ تھا کہ آج تقریر کرنی ہے۔ آج سے ڈیڑھ سال قبل علامہ اقبال کی زندگی میں اقبال کے تصور مومن کو پیش کر کے خود ان سے داد حاصل کی تھی۔ اور آج ان کے انتقال کے بعد مختصر اپنا تحفہ عقیدت ان کی سرمدی اور ابدی دعاؤں کی امید پر پیش کر رہا ہوں۔"

خط و کتابت کے تعلق سے ایک بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ دونوں میں مراسلت کا سلسلہ ۱۹۳۱ء کے بعد شروع ہوا، کیونکہ اقبال کا جو خط ہمیں حاصل ہو سکا ہے، وہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے ذریعہ بھیجا گیا اور اس کی وجہ اقبال نے یہ لکھی ہے کہ نواب صاحب کا پتہ انہیں معلوم نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اس سے پہلے دونوں میں خط و کتابت ہوتی تو ان کا پتہ بھی اقبال کے پاس ضرور ہوتا۔ یہی بات اس لئے قریب قیاس معلوم ہوتی ہے کہ بہادر خاں کی عملی جدوجہد کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوتا ہے اور اسی زمانے میں ان کے کردار اور گفتار کے چرچے حیدر آباد کی سرحدوں سے باہر پہنچنے لگے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں وہ ایک خوش پوش اور سخن سنج حیدر آبادی نواب کی حیثیت سے اقبال سے ملے ہوں گے لیکن ۳۱ء کے بعد جیسے جیسے ان کی قومی خدمات کی شہرت اقبال تک پہنچنے لگی ہوگی ویسے ویسے قدرتاً یہ رسمی تعارف مستحکم دوستی میں مبدل ہو گیا ہوگا۔ کلام اقبال سے ان کو ایسا شغف تھا کہ اس کی تشریح و توضیح کے لئے انہوں نے اپنے گھر میں حلقۂ درس اقبال بھی قائم کیا تھا، اور عجب اتفاق ہے کہ اسی حلقے کے درس سے اٹھ کر وہ اپنے ایک عزیز دوست ہاشم یار جنگ کے ذر

میں گئے اور کھانے سے پہلے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور سکندر علی وجد سے اقبال کے اس شعر

ہراک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے تھے کہ حقہ کے پہلے ہی کش کے ساتھ ایک ہچکی آئی اور ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

گویا شاہین بلند پرواز کا ''ذوق سفر'' اسے ''ہراک مقام سے آگے'' لے کر چلا گیا۔!

مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا

○○○○○

ماخوذ از ''اقبال اور حیدر آباد، مرتبہ نظر حیدر آبادی۔ ناشر: اقبال اکاڈمی کراچی۔ اپریل ۱۹۶۱ء

○

''اقبال نوائے عصر تھا۔ مبارک ہیں وہ جنھوں نے اس کی صدا پر لبیک کہا۔ کلام اقبال کو پڑھ کر سر دھننا اور وجد کرنا اقبال کی حقیقی قدر نہیں ہے۔ اقبال کے سارے کلام کا خلاصہ عمل ہے۔ اگر چند نوجوان بھی آمادہ عمل ہو گئے تو اقبال کی روح کو حقیقی مسرت ہوگی۔''

(بہادر یار جنگ کے خط مورخہ: ۱۰/اپریل ۱۹۴۴ء سے اقتباس۔ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ مرتبہ نذیر الدین احمد۔ سن اشاعت۔ ۱۹۷۰)

محمد احمد خاں

علامہ اقبال اور بہادر یار جنگ

مولانا روم سے جو نسبت اقبال کو تھی' وہی تعلق اقبال سے بہادر یار جنگ کو رہا۔ وہ پیر یہ مرید' وہ شہباز یہ شاہین! خود بہادر یار جنگ کہا کرتے تھے'' کسی کا رہنما کوئی اور ہو تو ہو' میرا رہنما اقبال ہے''!!

شاعری اور خطابت' اظہار خیال کے دو موثر ترین ذرائع ہیں۔ عربوں کو تو ان پر اتنا ناز بلکہ غرہ تھا وہ اپنے آپ کو عرب (صاحب زبان) اور دوسروں کو عجم (بے زبان) کہا کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی شاعری اور خطابت نے بڑے بڑے ہنگامے برپا کئے' بہت سے معرکے سر کئے بلکہ تاریخ بنائی ہے۔ اردو زبان خوش نصیب ہے کہ اس کو اقبال جیسا شاعر اور بہادر یار جنگ جیسا خطیب نصیب ہوا۔ ان کی شاعری اور ان کی خطابت نے اردو کو دوسری زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل بنا دیا! اقبال کی زبان سے کلام موزوں نکلتا تو شعر کا قالب اختیار کر لیتا اور ذہن کو مسخر اور قلب کو مسحور کر دیتا۔ بہادر یار جنگ تقریر کرتے یا گفتگو تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے اور پھول کی ان پتیوں سے ہیروں کے جگر کٹ جاتے تھے! ان پھولوں میں رنگ و نکہت اقبال کے اشعار آبدار ہی کی ہوتی تھی!! سچ ہے'' ان من البیان لسحرا''۔ وہ شاعر بے بدل یہ خطیب بے مثل! بہادر یار جنگ اپنی تقریروں میں سب سے زیادہ اقبال کے اشعار استعمال کیا کرتے تھے' اور یہ استعمال ایسا برجستہ اور اتنا برمحل ہوتا تھا کہ گویا اقبال نے اسی موقع کے لئے یہ اشعار کہے تھے۔ اشعار ہی نہیں اقبال کی اصطلاحیں تلمیحیں' محاورے اور ترکیبیں وہ اپنی تقریر اور گفتگو میں نہایت بے تکلفی سے استعمال کیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ تو انہوں نے پوری کی پوری تقریر اقبالی زبان میں کی ہے۔ اقبال کی زندگی میں سب سے پہلا یوم اقبال ان کی اور ڈاکٹر لطیف کی تحریک پر حیدرآباد دکن کے ٹاؤن ہال میں منایا گیا۔ اس جلسہ میں وہ شاہینی انداز سے شریک ہوئے تھے۔ راجستھانی شملہ' حیدرآبادی چست شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ میں وہ اتنے باوقار نظر آ رہے تھے کہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

اپنے ساتھ وہ اقبال کی تمام مطبوعات لے آئے تھے اور تقریر شروع کرنے سے پہلے' انہوں نے یہ ساری کتابیں صدر کی میز پر ڈھیر کر دی تھیں۔ سننے والوں نے سمجھا کہ دوران تقریر وہ ان کتابوں میں سے منتخب اشعار پڑھ کر سنائیں گے تقریر شروع ہوئی' تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اقبالی زبان میں جاری رہی۔ لیکن انہوں نے کسی کتاب کو چھوا تک نہیں۔ یہ نہیں کہ ان کی تقریر اقبال کے اشعار سے خالی تھی ویسے بھی ان کی کوئی تقریر اقبال کے اشعار سے خالی نہیں ہوا کرتی تھی' پھر یہ تو یوم اقبال کا جلسہ تھا۔ تقریر کے دوران انہوں نے کئی اشعار سنائے یہ انہیں زبانی یاد تھے۔ اس طرح اقبال کے سینکڑوں اشعار ان کی نوک زبان پر تھے۔ پھر ان اشعار کو وہ جس انداز سے پڑھتے تھے وہ انہیں کا حصہ تھا۔ بعض الفاظ پر زور اور بعض کی نہایت سبک انداز میں ادائی' پھر ان کی شیریں مگر گرجدار آواز کا زیر و بم یہ سب مل ملا کر سامعین کے دلوں پر ایک خاص اثر چھوڑ جاتے تھے جن لوگوں نے ان کی زبان سے اقبال کے اشعار سنے ہیں ان کا تاثر آج تک محو نہیں ہوا ہے۔

وہ اقبال کی زبان اور کلام ہی سے نہیں اس کی فکر اور پیام سے بھی بے حد متاثر تھے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اقبال کی فکر ہی نے انہیں اقبال کی زبان اور کلام ہی کا نہیں' اقبال کی شخصیت کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اس گرویدگی کا عالم یہ تھا کہ جب کبھی ان کے سامنے اقبال کا نام لیا جاتا یا کوئی شعر پڑھا جاتا تو دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا کہ گویا کوئی بیٹھا' ان کے قلب کو گدگدا رہا ہے یا کسی نے ان کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے! انہیں اقبال اور اقبال کے کلام و پیام سے محبت ہی نہیں عشق تھا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اقبال کا کوئی ایک شعر' اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے سفر اور حضر میں ان پر کئی کئی دن تک طاری رہتا۔ اقبال کے اشعار کو بھی پڑھتے اور ان پر سر دھنتے رہے ہیں' لیکن اقبال کے کلام و پیام کا ایسا شیدائی شاید ہی کوئی دوسرا ہوگا!

اقبال کے کلام و پیام سے والہانہ لگاؤ ہی کا یہ اثر تھا کہ انہوں نے اپنی کوٹھی پر ہفتہ میں ایک دن ''درس اقبال'' کا سلسلہ شروع کیا جو بالالتزام ان کی وفات تک جاری رہا۔ درس اقبال'' سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ خود درس دیتے تھے۔ نہیں اس محفل درس کے معلمین تھے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور پروفیسر غلام دستگیر رشید اور متعلمین تھے بلدۂ حیدرآباد

کے معززین اور جامعہ عثمانیہ کے طلبا۔ اس محفل درس میں اقبال کا کلام سبقاً پڑھا جاتا تھا۔ پروفیسر رشید اشعار کے لغوی و لفظی معنے بیان کرتے ڈاکٹر رضی اور ڈاکٹر یوسف ان کے مطالب کی توضیح کرتے پھر زبان و بیان پر رد و قدح ہوتی اور اقبال کے فلسفہ و پیام کی تشریح کی جاتی ..... اور سب کے آخر میں بہادر یار جنگ بولتے اور جب بولتے تو دل یہ کہتا کہ ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ اقبال کا ذکر اور بہادر یار جنگ کا بیان ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ ایک سحر تھا۔ کہ اس وقت بھی نہ ٹوٹتا جب یہ محفل برخاست ہو جاتی!! افسوس کہ اس زمانہ میں ٹیپ ریکارڈ ایجاد نہ ہوا تھا۔ اگر ہوا ہوتا اور ان جواہر پاروں کو محفوظ کر لیا جاتا تو اقبالیات کا انمول خزانہ آج بھی ملت کی تحویل میں ہوتا۔ ان مجالس میں ''اسرار خودی'' ''رموز بے خودی'' ''پیام مشرق'' ''جاوید نامہ'' کے ایک شعر کا مطالعہ ہوا۔ آخری درس اقبال کی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کی نظم ''حکمت کلیمی'' کا ہو رہا تھا کہ ؎ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

علامہ اقبال کے کلام و پیام کے وہ عنفوان شباب ہی سے عاشق تھے اور اسی عشق کے باعث ان کے دل میں علامہ سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ملاقات کا یہ واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ۱۹۳۱ء میں انہوں نے فریضہ حج ادا کیا' پھر بلاد اسلامیہ کی سیاحت کرتے ہوئے وہ واپس دہلی آئے وہاں سے لاہور پہنچے اور علامہ اقبال سے ملاقات کی۔ میری یادداشت کے مطابق یہ ملاقات غالباً جنوری ۳۲ء میں ہوئی۔ اس ملاقات کی تین باتیں بڑی دلچسپ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملاقات سے قبل وہ علامہ کے خادم خاص علی بخش سے ملے اور اس سے یہ فرمائش کی کہ وہ علامہ کو فکر سخن کرتے دیکھنا چاہتے ہیں اور اس طرح دیکھنا چاہتے ہیں کہ خود علامہ کو اس کی مطلق خبر نہ ہو۔ علی بخش نے ان سے کہا کہ وہ دوسرے دن علی الصبح' بعد نماز فجر آ جائیں کہ یہی وقت علامہ کے فکر شعر کا ہوتا ہے دوسرے دن جب بہادر یار جنگ حضرت علامہ کی کوٹھی پر پہنچے تو علی بخش نے انہیں چارپائی پر ایسی جگہ بٹھا دیا' جہاں سے وہ اقبال کو فکر سخن کرتے دیکھ سکتے اور شعر گنگناتے سن سکتے تھے لیکن اقبال کی نظر ان پر نہ پڑ سکتی تھی۔ کیسی عجیب و غریب خواہش تھی یہ! کلام اقبال کا مطالعہ کرنے والوں میں ایسا کون ہوگا' جس کو ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اشتیاق نہ رہا ہو۔ ان کی مجلسوں میں شریک ہونے والوں میں سے اکثر و بیشتر کے تاثرات شائع ہو چکے ہیں ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہ رہی کہ وہ علامہ سے مختلف مسائل پر گفتگو اور ان کے ارشادات سے حسب مقدور

استفادہ کرے لیکن شاید ہی ایسا کوئی ہوگا جس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہو کہ وہ اقبال کو اس حالت میں دیکھے جب کہ ان پر اشعار وارد ہو رہے ہوں! بہادر یار جنگ نے علامہ اقبال کو اس حالت استغراق میں چپکے سے دیکھ ہی لیا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کے بعد انہوں نے علامہ سے بہ تعیین وقت ملاقات کی۔

ایک اہم بات اس ملاقات کی یہ تھی کہ جب بہادر یار جنگ رخصت ہونے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور علامہ سے مصافحہ کے لئے انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو اقبال نے ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا اور فرمایا ''وعدہ کرو کہ ملت کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کرو گے'' آپ اس کو مصافحہ رخصتی کہیے یا عہد خدمت' میں تو اس کو بیعت کہتا ہوں بیعت جو ایک پیر مرد نے ایک جوان رعنا سے لی! اور بیعت بھی کس بات پر؟ اس بات پر کہ وہ ملت اسلامیہ کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے گا۔ گویا شیخ وقت نے سالک طریقت کو رسم و راہ منزل سے باخبر کر دیا! خیال رہے کہ اس وقت حضرت علامہ پچپن برس کے پیٹھے میں تھے اور بہادر یار جنگ ۲۶'۲۵ سال کے کڑیل جوان! دنیا جانتی ہے کہ اس بہادر جوان نے اپنی عمر کے بقیہ شب و روز کس طرح گذارے۔ محبوب نگر' نلگنڈہ اور ورنگل کی تپتی ہوئی دھوپ میں سنگلاخ میدانوں کو عبور کر کے قریہ قریہ اسلام کا پیغام اس نے پہنچایا اور بائیس ہزار گم کردہ راہوں کو سیدھا راستہ دکھایا۔ مجالس میلاد کو اپنے سوز دردوں سے گرمایا اور نیند کے ماتوں کو خواب غفلت سے جگایا اور انہیں نبیؐ کے اسوہ پر چلنے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کی تلقین کی۔

بہادر یار جنگ نے اپنی وفات سے چند ماہ قبل علامہ سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر بڑے رقت انگیز پیرایہ میں کیا تھا۔ فرمایا علامہ کی وفات ہو گئی تو ان کی میت دیدار عام کے لئے کوٹھی کے صحن میں رکھی گئی۔ لوگ آتے تھے اور دیدار کر کے چلے جایا کرتے تھے۔ مجمع عام میں سے ایک شخص قلندرانہ وضع میں اچانک برآمد ہوا' میت کے قریب گیا' منہ سے کفن سرکایا' چہرہ پر ایک نظر ڈالی اور با آواز بلند یہ شعر پڑھا ؎ بس اتنی سی حقیقت تھی فریب خواب ہستی کی

کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

پھر مجمع میں غائب ہو گیا۔ اس واقعہ کو انہوں نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر کئی آدمیوں کے سامنے بار بار دہرایا تھا! کیا معلوم کہ انہیں اسی زمانہ میں فریب خواب ہستی کی حقیقت

سے کسی نے آگاہ کر دیا ہو اب خود اس عاشق اقبال کی وفات کا واقعہ سن لیجیے۔ ۲۵ جون ۴۴ء کو اتوار کا دن تھا اسی دن حسب معمول عصر اور مغرب کے درمیان ان کی کوٹھی پر درس اقبال کی محفل آراستہ ہوئی' معلمین اور متعلمین جمع تھے اور وہ خود رونق محفل بنے ہوئے تھے۔ مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' زیر مطالعہ تھی۔ حکمت کلیمی والی نظم کا درس شروع ہوا۔ پروفیسر رشید نے ترجمہ کیا معانی و مطالب بیان کئے۔ دیگر اساتذہ نے بھی تشریح و توضیح کی خود بہادر یار جنگ نے اپنے دریائے بے بہا لٹائے۔ ایک شعر کے بعد دوسرا شعر پڑھا جاتا رہا یہاں تک کہ پروفیسر رشید نے یہ شعر پڑھا۔

مرد حق افسون این دیر کہن ‏ ‏ ‏ ‏ از دو حرف ربی الاعلی شکن

پھر اس کے معنی و مطالب کو بیان کیا اور آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ بہادر یار جنگ نے انھیں روک دیا۔ کہنے لگے "رشید صاحب! بس یہاں ٹھہر جائیے یہ مقام یوں ہی گذر جانے کا نہیں ہے!— اور محفل برخاست ہوگئی۔ انہوں نے نماز مغرب با جماعت ادا کی اور مابعد اپنے ایک دوست ہاشم علی خاں کے گھر روانہ ہو گئے' جہاں چند مخصوص احباب کی دعوت تھی۔ اس دعوت میں بھی درس اقبال'' کے ایک استاد ڈاکٹر رضی الدین صدیقی موجود تھے۔ ان ہی کے برابر والی کرسی پر وہ بیٹھ گئے۔ درس اقبال سے اٹھ کر ہی تو وہ آئے تھے لہذا زبان پر وہی شعر۔

مرد حق افسون این دیر کہن ‏ ‏ ‏ ‏ از دو حرف ربی الاعلی شکن

جاری تھا۔ گفتگو کا موضوع اقبال فکر اقبال اور یہ شعر اقبال بن گیا۔ دیر تک متاع اقبال کو وہ تن آسانوں میں لٹاتے رہے۔ اسی دوران حقہ سامنے آیا۔ انہوں نے ایک کش لیا اور دیر کہن کے افسوں کو ایک ہی جھٹکے میں توڑ کر نوائے سوختہ در گلو اپنے رب اعلیٰ سے جا ملے! حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں'' اقبال کا یہ مصرع رحلت سے ایک ہفتہ قبل ان پر طاری تھا۔ وہ اس کو بار بار دہرایا کرتے تھے اس دنیا سے عقبیٰ کا سفر عقبیٰ سے ملاء اعلیٰ کا سفر' پھر سفر ہی سفر! یہی ذوق سفر تو حقیقی زندگی ہے' کیا تعجب کہ اسی حیات دوام اور سفر مدام کے تمام مناظر اسی زمانہ میں انہیں دکھائے گئے ہوں اور اس کی تمام منزلیں ان پر آسان کر دی گئی ہوں!! دنیا میں آج تک جتنے علوم و فنون رائج ہوئے ہیں۔ ان کی چھان، پھٹک تنقید و تحلیل ہوتی رہی ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ اس کے بغیر آگے بڑھنے کا راستہ نہیں ملتا۔ شاعری بھی ایک فن ہے۔ گو اس کا شمار فنون لطیفہ میں کیا جاتا ہے تاہم اس کو بھی تنقید کی بھٹی میں تپایا جاتا رہا ہے اور نقادان سخن نے یہ بھٹی کچھ اس طرح سلگائی ہے کہ اس کی

آگ سے کوئی شاعر نہ بچ سکا۔ یہ درست کہ نقاد کا اپنا ایک مقام ہے اور تنقید اس کا فرض منصبی، لیکن تنقید بہر حال تنقید ہے جراحی نہیں! نقاد کا قلم جب جراح کا نشتر بن جائے تو تنقید سے پوسٹ مارٹم کی بو آنے لگتی ہے اور یہ حادثہ اس صورت میں رونما ہوتا ہے جب ناقد سخن شناسی کو اپنا پیشہ بنالیتا ہے۔ نقد سخن کے لئے محض سخن شناسی کافی نہیں۔ شاعر کے ساتھ اور خصوصاً ہر بڑے شاعر کے ساتھ انصاف تو اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب نقاد سخن شناس ہی نہیں سخن فہم بھی ہو۔ سخنوری اگر مشکل ہے تو سخن فہمی بھی کچھ آسان کام نہیں! شاعر اور اس کی شاعری کے سوتے عشق رسول سے پھوٹے ہیں ..... اور بہادر خاں کو بہادر خاں حُبِّ قرآن اور عشق رسولؐ ہی نے تو بنایا تھا۔ یہی ان دونوں میں قدر مشترک تھی۔ حقیقت میں نہ وہ شاعر نہ یہ مقرر، دونوں کے دونوں قرآن کے شیدائی اور محمدؐ کے فدائی! یہی ان دونوں کا غیر مرئی وجدانی اور روحانی رشتہ تھا!!! اقبال کو انہوں نے نہ صرف پڑھا اور سمجھا تھا بلکہ اس کے کلام و پیام کی روح کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال کا ''حال'' بن گیا! وہ فرماتے تھے کہ جب مجھے اپنی جاگیر' خطاب اور مناصب سے دستبرداری کا مرحلہ پیش آیا تو میں نے اپنے طور پر بھی غور کیا اور اپنے مخلصوں سے بھی مشورہ کیا۔ عجیب گومگو کا عالم تھا کہ اقبال کے صرف ایک شعر نے میری مشکل حل کردی۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اور میں نے ایک لمحہ توقف کئے بغیر دنیا کی آلائشوں کو جھٹک کر اپنے دامن کو پاک کرلیا'' ..... اقبال نے مردِ مومن اور مردِ قلندر کی بڑی دلکش اور جاذب نظر تصویر اپنے اشعار میں کھینچی ہے۔

یہ تصویر بہادر خاں سے مشابہ ہی نہیں بہادر خان ہی کی دکھائی دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ مجسم فکرِ اقبال تھے جبھی تو بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنس دان ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سابق وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ و اسلام آباد یونیورسٹی کہا کرتے تھے کہ بہادر یار جنگ کو دیکھ کر دانائے راز کے اسرار و رموز فاش ہو جایا کرتے تھے!

(ارمغان دکن سے اقتباسات۔ ناشر۔ بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی۔ مطبوعہ ۱۹۷۷ء)

○○○○

نذیرالدین احمد

علاّمہ اقبال اور
قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ

ہم مولانا روم کے کلام میں سورج کی روشنی میں چراغ جلا کر ایک بزرگ کو تلاش کی منزل میں سرگرداں دیکھتے ہیں۔ جب ان بزرگ سے سوال کیا جاتا ہے کہ اجالے میں چراغ لئے آپ کس کو تلاش کر رہے ہیں تو فرمایا کہ ایک مرد کامل کی تلاش ہے۔ مولانا روم کو جس مرد کامل کی تلاش تھی وہ دانائے راز اقبال کی صورت میں، ان کے افکار کا علمبردار، ان کا مطلوب مرید، ان کو مل گیا۔

اقبال کا پیام دراصل قرآن کا مطلوب انسان تھا۔ ایک ایسا مرد مجاہد جس کی زندگی کا نصب العین، ملت کا نشاۃ ثانیہ اور احیاء دین ہو اور جس کا قلب، خلافت الٰہیہ کے تصور سے مزین ہو، بارگاہ رب العزت میں اقبال نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی تھی۔

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر،

اس طرح خلافت الٰہیہ کے تصور پر مبنی، خلافت کے قلب و جگر کی اقبال کو تلاش تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ''انیسویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کے دور اول تک مسلمانوں میں صرف چار شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے مسلمانوں کو ماضی کے آئینہ میں دیکھا اور حال کی الجھنوں میں پھنسا پایا۔ اور خوش آیند مستقبل سے دور دیکھا۔ پھر ماضی کی عظمت کی حقیقتوں کا جائزہ لیا، حال کو مطابق حال بنانے کی کوشش کی اور مستقبل کے لئے راستے ہموار کئے، ان میں جمال الدین افغانی، علامہ اقبال، قائداعظم محمد علی جناح اور محمد بہادر خاں (بہادر یار جنگ) شامل ہیں۔''

(حوالہ: اقبال اور قرآن از علامہ سلیمان ندوی)

''اقبال اور بہادر یار جنگ کا اصل رابطہ اطاعت خدا اور عشق رسول کی رسی سے بندھا ہوا ہے۔ اقبال نے فنافی اللہ ہوکر مقام خودی پر فائز ہونے کی جو آرزو کی تھی اس کا حاصل بہادر یار جنگ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔

دونوں کا فکری ارتکاز توحید اور رسالت محمدیؐ کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔'' (حوالہ: مرد مؤمن از مولوی میاں محمد سعید ص ۱۲۸)

کوئی صاحب نظر، نظر حیدر آبادی کے اس حقیقت افروز اظہار خیال سے اختلاف نہیں کرسکتا کہ:

'' بہادر یار جنگ کی شخصیت کا خمیر ہی اقبال کی فکر سے اٹھا تھا، قائد ملت کی فکر ونظر کے سرچشمۂ شیریں کے بارے میں قائد ملت کے رفیق پروفیسر غلام دستگیر رشید نے سچ فرمایا کہ:

'' ان کی فکر ونظر کا ایک سرچشمۂ شیریں کلام اقبال تھا۔ اقبال کے کلام میں انہیں قلب ونظر کا ایک آئینہ مل گیا تھا۔''

(حوالہ: پروفیسر غلام دستگیر رشید مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں، مرتبہ نذیر الدین احمد ص ۲۹)

اقبال مغرب دیدہ اور اسلام فہمیدہ سے محمد بہادر خاں کا کتابی تعلق وتعارف سولہ سترہ سال کی عمر سے رہا۔

'' آج سے ۲۵ رسال قبل ہماری شعر گوئی اور مطالعہ دواوین کا سب سے اچھا وقت صبح کے ابتدائی لمحات ہوا کرتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے ادب نے ایک معیاری کیفیت پیدا کی تو خود بخود یہ احساس ہونے لگا کہ شاعر پیدا ہوتا ہے، بنتا نہیں۔ اور ہماری میز سے ہٹ کر دواوین الماریوں کی زینت بنتے گئے۔ اور بانگ درا کے سوا میز پر کچھ باقی نہیں رہا۔ آخری دور میں اگر کسی کے کلام نے اقبال کا ساتھ دیا تو مولانا روم کی مثنوی تھی۔ (حوالہ: میں مطالعہ کس طرح کرتا تھا، مشمولہ نگارشات بہادر یار جنگ ص ۵۹۔ مرتبہ نذیر لدین احمد)

۱۹۳۱ء تک مسلمانوں کے قائد اور خطیب سحر البیان کی حیثیت سے سارے ہندوستان میں ان کی شہرت کا ڈنکا بج چکا تھا، اس وقت ان کی عمر صرف ۲۶ برس تھی۔ اور اس وقت تک ان کی

نظر اقبال کی فکر کے عمیق گوشوں تک رسائی پا چکی تھی۔ وہ اقبال کی فکر، کام، کلام اور مقام سے اس درجہ واقف اور متاثر تھے کہ اس تاثر نے ان کو اقبال کا گرویدہ بنا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال کے الہامی کلام نے انہیں، اقبال کی نوائے عاشقانہ کا حاصل بنا دیا۔ اقبال کے درد دل کو جس مرد حق نے سمجھا اور اوروں کو سمجھایا وہ محمد بہادر خاں کی ذات تھی۔ ابتدا میں خود اقبال کو اس امر کی شکایت تھی کہ اقبال کو شاعر سمجھنے والوں کی تو کمی نہیں ہے لیکن ان کے پیام کو سمجھنے والے کم ہیں۔

''لوگوں نے شمع کا نور دیکھا، لیکن اس کے سوز دل کا اندازہ نہیں کیا۔ جگنو کی چمک دیکھی لیکن اس عاشق وارفتہ کی جگر سوزی اور اضطرار کا راز جان نہ سکے۔ اقبال کو شکایت تھی کہ لوگوں نے انہیں شاعر اور مغنی سمجھ لیا ہے لیکن اس پیام پر ان کی نظر نہیں گئی جو ان کی نوائے عاشقانہ کا حاصل تھی۔''

(حوالہ: کیا پوچھتے ہو کیسے کھو دیا۔ از محترم المقام مولوی سید خلیل اللہ حسینی قائد مجلس تعمیر ملت ص ۲۲)

قائد ملت کی اقبال فہمی کا تفصیلی تذکرہ کرنے سے قبل اقبال سے ان کی ملاقاتوں کا ذکر موجب دلچسپی ہوگا۔

علامہ اقبال سے نواب بہادر یار جنگ کی پہلی ملاقات

مولانا خواجہ حسن نظامی کو قائد ملت کی علامہ اقبال سے عقیدت و محبت اور ان کی والہانہ وابستگی کا علم تھا۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال نے دہلی کا دورہ فرمایا، دہلی میں وہ ڈاکٹر انصاری کے مکان میں مقیم رہے، نواب بہادر یار جنگ ان دنوں دہلی میں تھے۔ ۱۳ر مارچ ۱۹۳۳ء کے دن مولانا خواجہ حسن نظامی کے ہمراہ نواب صاحب نے پہلی بار علامہ اقبال سے ملاقات فرمائی۔

مولانا خواجہ حسن نظامی نے علامہ کی مصروفیت کا ہفتہ وار روزنامچہ دہلی مورخہ ۱۶ر مارچ ۱۹۳۳ء میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''۱۳ر مارچ ۳۳ء کو بارہ بجے نواب بہادر جنگ کے ساتھ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ملنے گیا جو ڈاکٹر انصاری کے مکان پر مقیم تھے، نواب بہادر یار جنگ انکے مداح اور معتقد ہیں۔ میں نے نواب صاحب کا ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ان الفاظ میں تعارف کروایا۔

''اگر آپ بادشاہ ہیں تو یہ آپ کے سپہ سالار ہیں اور اگر آپ شمع ہیں تو یہ آپ کے پروانے ہیں اور اگر آپ دانا ہیں تو یہ آپ کے دیوانے ہیں۔''

(حوالہ: اوراق گم گشتہ از رحیم بخش شاہین ص ۲۶)

علامہ اقبال سے قائد ملت کی دو ایک اور ملاقاتوں کا مزید حال بھی علم میں آتا ہے مگر کتنی مرتبہ نواب صاحب کو علامہ اقبال سے نیازمندی کا موقعہ ملا۔ اس بارے میں عدم معلومات کے باعث کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔

علامہ اقبال کی نواب صاحب سے خط و کتابت کے بارے میں بھی کچھ تفصیلات کا علم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال کی موجودگی میں اقبال کا تصور شاہین پر ——— تقریر کرنے اور داد پانے کا مژدہ بھی سننے کو ملتا ہے۔ اس تقریر کا ذکر نواب صاحب نے یوم اقبال کے جلسے میں تقریر کے دوران فرمایا تھا:

''آج سے ڈیڑھ سال قبل علامہ اقبال کی زندگی میں اقبال کے تصور مومن کو پیش کر کے خود ان سے داد حاصل کی تھی اور آج ان کے انتقال کے بعد اپنا تحفہ عقیدت ان کی سرمدی اور ابدی دعاؤں کی امید پر پیش کر رہا ہوں۔''

۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال نے پہلی بار قائد ملت کو بذریعہ خط مخاطب فرمایا تھا۔ اس وقت تک علامہ اقبال نواب صاحب سے غائبانہ تعارف رکھتے تھے۔ یہ خط کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی اعانت سے متعلق ہے۔

لاہور ۱۴ ستمبر ۳۳ء

مخدومی جناب نواب صاحب!

السلام علیکم

مظلومین کشمیر کی امداد کے لئے آپ سے درخواست کیلئے یہ عریضہ لکھتا ہوں۔ اس وقت حکومت کی طرف سے ان پر متعدد مقدمات چل رہے ہیں۔ جن کے اخراجات وغیرہ کے لئے فنڈ کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تھوڑی سی توجہ سے یہ مشکل حل ہو جائے گی۔ اس سے پہلے ایک خط مجھے ایک بزرگ محمد اعظم عثمان آباد کی طرف سے آیا تھا۔ انہوں نے خود بھی چندہ کر کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا اور مجھے یہ بھی لکھا تھا کہ

نواب بہادر یار جنگ کے نام اقبال کے خط کا عکس

(مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۳۳ء)

آپ کی توجہ اس طرف منعطف کروں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مسلمانانِ کشمیر کو امداد کا مستحق تصور کرتے ہیں۔

طبّاع اور ذہین قوم ایک مدت سے استبداد و ظلم کا شکار ہے۔ اس وقت مسلمانانِ ہند کا فرض ہے کہ ان کے موجودہ مشکلات میں ان کی مدد کی جائے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ یہ خط خلیفہ عبدالحکیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کے معرفت آپ تک پہنچاتا ہوں۔ مجھے آپ کا اڈریس معلوم نہ تھا اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ میرا خط کسی اور طرف چلا جائے۔

مخلص

اقبال

نواب صاحب کے ایک (اور) خط سے علامہ اقبال سے نواب صاحب کی خط و کتابت کے سلسلہ کا پتہ چلتا ہے۔ یہ مذکور خط نواب صاحب نے شیخ عطاء اللہ صاحب پروفیسر شعبۂ معاشیات کے نام لکھا تھا۔

''اس سے قبل بھی تحریر کر چکا ہوں کہ مکاتیب اقبال (موسومہ قائد ملت) کا آپ سے زیادہ میں متلاشی ہوں اپنے کاغذات کا ایک ایک پرچہ تلاش کیا لیکن افسوس ہے کہ وہ طبق ہاتھ نہ آیا۔''

(حوالہ: خط نمبر ۴۸۲ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول)

قائد ملت علامہ اقبال سے اپنی دوسری ملاقات کے سلسلے میں یہ دلچسپ واقعہ بیان فرماتے تھے کہ ''ایک بار لاہور گئے اور اس کی انہیں بڑی تمنا تھی کہ وہ اقبال کو شعر کہتے ہوئے حال میں دیکھیں۔ خوش قسمتی سے وہ بہت سویرے آہ سحر خیزی کے وقت جاوید منزل پہنچ گئے، حسب عادت اقبال تلاوت سحر کے بعد شعر کہنے میں محو تھے، علی بخش مرحوم کی مدد سے نواب صاحب بڑی خاموشی سے ان کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ اقبال اپنی شعر گوئی اور گنگنانے میں محو تھے۔ یہ مشغلہ ختم ہوا تو باہمی گفتگو ہوئی۔ یہ واقعہ ایک نمونہ اور علامت ہے کہ وہ اقبال اور کلام اقبال سے کس طرح دل بستگی رکھتے تھے۔''

(حوالہ: اقبال اور قائد ملت بہادر خان مرحوم، از پروفیسر غلام دستگیر رشید (رفیق تائہ

ملت) مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں ص ۲۹ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی حیدرآباد دکن)

نواب صاحب کی علامہ اقبال سے تیسری ملاقات کے بارے میں مولوی عبدالرحمٰن سعید رفیق قائد ملت تحریر فرماتے ہیں کہ ''اس دوسری ملاقات کے تیسرے روز نواب صاحب نے بہ تعیین وقت حضرت اقبال سے ملاقات کی اور ملت اسلامیہ کی تنظیم اور اس کے مستقبل کے بارے میں ان سے تبادلۂ خیال کیا۔

بوقت رخصت مصافحہ کرتے ہوئے اقبال نے فرمایا کہ یہ مصافحہ اس امر کا عہد ہے کہ نواب صاحب اپنی خداداد صلاحیتوں کو خدمت ملت کے لئے وقف کریں گے۔'' (حوالہ: صدق جدید لکھنؤ ۱۷ اگست ۳۷ء)

علامہ اقبال سے قائد ملت کی ملاقاتوں میں یہ واقعہ کہ ''جب بہادر یار جنگ رخصت کے لئے کھڑے ہوئے اور علامہ سے مصافحہ کے لئے انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو اقبال نے ان کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا اور فرمایا۔

''وعدہ کرو کہ ملت کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کردو گے۔''

آپ اسے مصافحہ رخصتی کہئے یا عہد خدمت، میں تو اس کو بیعت کہتا ہوں۔ بیعت جو ایک پیر مرد نے ایک جوان رعنا سے لی، گویا شیخ وقت نے سالک طریقت کو رسم و راہ منزل سے باخبر کر دیا۔ دنیا جانتی ہے کہ اس بہادر جوان نے اپنی عمر کے شب و روز کس طرح گذارے۔

(حوالہ: علامہ اقبال اور بہادر یار جنگ، از مولوی محمد احمد خانصاحب)

سچ تو یہ ہے کہ متذکرہ بالا واقعہ علامہ اقبال کی نظر کیمیا کا مظہر ہے کہ قائد ملت کو علامہ اقبال نے رسم و راہ شاہبازی کی منزل سے باخبر کر کے انہیں اپنے منصب کا جانشین بنا دیا۔

بہادر یار جنگ کی زندگی، اقبال کے نظریات پر ملت اسلامیہ کی سیاست کی بنیاد رکھی، وہ اپنی جادو بیان تقریروں میں اقبال کے آتشیں افکار کی گرمی سے قوم میں حوصلہ اور جذبہ پیدا کرتے اور غلاموں کے لہو کو سوز یقین سے بدل دیتے تب ہی تو کنجشک فرومایہ شاہین کے مقابل ہوتے۔

''اقبال کو انہوں نے نہ صرف پڑھا اور سمجھا تھا بلکہ اس کے کلام و پیام کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال کا قال ان کا حال بن گیا۔ مرحوم خود اقبال کی تعلیم اور ان کی تمناؤں کا مجسم نمونہ تھے اور درس اقبال کے وقت جب وہ نظروں کے سامنے ہوتے تو پھر اقبال

کے بہت سے اشعار از خود واضح ہو جاتے تھے اور ان اشعار میں ایک نیا لطف محسوس ہونے لگتا تھا۔'' (ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، رفیق قائد ملت)

اس خصوص میں علامہ اقبال کے تعلق سے نواب صاحب کے احساسات کو ان کی تقریر و تحریر کے آئینے میں دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ اقبال کی فکر کا کوئی گوشہ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔

''اقبال نے خود اپنے الفاظ میں حجازی لے کو اپنے ہندی نغمہ میں ایسا دلکش بنایا کہ کتاب اللہ جس کو اس کے ماننے والوں نے پس پشت ڈال دیا تھا آج پھر ہماری آنکھوں کا نور بن رہی ہے، میری دلی تمنا ہے کہ آپ کے یہ اجتماع کامیاب ہوں اور ان کے شرکا، گفتار کے اس غازی کے خواب کی تعبیر بنیں۔ اور کردار کے غازی بن کر اس کی روح کو جنت الفردوس میں حقیقی سامان اطمینان مہیا کریں۔'' (حوالہ: پیام قائد ملت بضمن یوم اقبال ص ۴۰۹، ۴۱۰ مکتوب نمبر ۳۹۶ مکاتیب بہادر یار جنگ، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی)

''یہ سن کر اقبال سے میری عقیدت بڑھ گئی کہ ان کے مطالعہ نے آپ کی بے یقینی کو یقین کے راستے پر ڈال دیا۔ ایمان صحیح کی منزل جس سے آپ اپنے آپ کو محروم سمجھتے ہیں اب زیادہ دور نہیں ہے، میں آنکھوں کے بہاؤ کو قلب کا غسل کہا کرتا ہوں۔ خدا آپ کی اس رقت کو اور بڑھائے۔ اس سے سخت دل میں وہ نرمی پیدا ہوگی جو نقوش ایمانی کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اب جب کہ اقبال اور رومی کا آپ مطالعہ کر چکے ہیں، قرآن سے قریب ہونے کی کوشش کیجئے۔'' (حوالہ: مکاتب بہادر یار جنگ ص ۵۴۶ مکتوب نمبر ۵۴۰ بنام جناب عبدالحمید نظامی، ایم۔اے نوائے وقت لاہور، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

''اقبال نوائے عصر تھا۔ مبارک ہیں جنہوں نے اس کی صدا پر لبیک کہا۔ اقبال کے سارے پیام کا خلاصہ عمل ہے۔ اگر چند نوجوان بھی آمادہ عمل ہو گئے تو اقبال کی روح کو حقیقی مسرت ہوگی اور ان کے دنیا میں آنے کا مقصد پورا ہو جائے گا۔'' (حوالہ: مکتوب نمبر ۵۶۷ ص ۵۶۹، ۵۷۰ مکاتیب بہادر یار جنگ، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی)

درس اقبال میں

طبع مسلم از محبت قاہر است
مومن ار عاشق نباشد کافر است

اقبال کا یہ شعر مولوی غلام دستگیر رشید نے پڑھا۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے قائد سے مخاطب ہو کر فرمایا:

نواب صاحب یہاں تو اقبال نے شاعری کی ہے۔ اتنا سخت فتویٰ میں نہیں سمجھتا کہ دیا جا سکتا ہے اور اس کا جواز قرآن میں ملتا ہو۔

قائد ملت نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ اقبال کوئی بات قرآن سے ہٹ کر نہیں کہہ سکتے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے والذین امنوا اشد حبا للہ (جو مومن ہوتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے اشد محبت ہوتی) پھر اس آیت شریف کی تائید میں حدیث شریف پیش کی، جو شرط ایمان کو بذات رسالتمآب سے محبت لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین (یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری ذات اس کے نزدیک اس کے والدین اور اولاد اور تمام محبوبین سے زیادہ محبوب تر نہ ہو جائے تب تک وہ مومن نہیں۔)

علامہ اقبال پر نواب صاحب کی کئی یادگار تقریریں ہیں، اقبال کا مرد مومن، اقبال کا شاہین زادہ اور فکر اقبال پر ان کی یادگار تقریروں میں دو تقریریں تو ایسی ہیں جس میں پوری تقریر اقبال کی تعلیمات و اشعاروں میں کی گئی ہے۔ حسن یار جنگ کے لئے یوم اقبال کی صدارت کی تحریک کرتے ہوئے نواب صاحب نے فرمایا کہ:

"میں حیران ہوں کہ یہ فرض میرے سپرد کیوں کیا گیا جب کہ مجھے انوری ہونے کا دعویٰ ہے نہ قاآنی ہونے کا۔ بہر حال ایک اقبال آفریدہ شاہین زادہ کی بزم اقبال کے اس جلسہ کی تحریک صدارت کیلئے کھڑا ہوں۔

حضرات! آج تہذیب مشرق آپ اپنا خون بہانے میں مصروف ہے۔ شاخ نازک پر بنے ہوئے آشیانے ایک ایک کر کے توڑے جا رہے ہیں، آج کسی کا آداب خود آگاہی سے واقف ہو جانا غلاموں کو شہنشاہی کے رموز سے واقف کر دینا ہے۔ آج کسی کی ہوس رانی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کر رہی ہے۔ آج جاوید نامہ کا قلزم خونی شکل اختیار کر گیا ہے۔ آج ہندوستان کے پاؤں کی بیڑیاں وسیع تر ہوتی جا رہی ہیں اور روح جعفر تن دیگر کی تلاش میں پھر رہی ہے۔ ان حالات میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک صحیح آدمی ہی اس جلسہ کی صدارت

کیلئے موزوں ہوسکتا ہے جو نگاہ بلند رکھتا ہے۔ جس کا سخن دلنواز ہے اور روح پر سوز۔ جو آفاق میں گم نہ ہوگی ہو بلکہ آفاق کو اپنے میں گم کرلیا ہو، جس نے خاکبازی نہ سیکھی ہو بلکہ خودی کا درس دیکھ کر دوسروں کو خود آگاہ بنادیا ہو اور میں یہ جذبہ نواب حسن یار جنگ بہادر میں پیدا ہوتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ابھی بانگ درا بند نہیں ہوئی ہے۔ ضرب کلیم کی تاب کس کو ہے اور ضرب کلیم کی تاب لانے کی کون ہمت کرسکتا ہے۔ جاؤ، پیام مشرق اس کے بعد کی منزل ہے شاید مسلمانوں کا یہ ذی عزت وہ طبقہ جس کو بیدار کرنے کے لئے اقبال کھڑا ہوا۔ جس دن وہ بیدار ہو جائے گا۔ اقبال کو پڑھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس عہد میں جب کہ بانگ درا کانوں سے اتر کر قلب سے قریب تر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ میں اس کو ہی مقام شکر سمجھتا ہوں۔ حیدرآباد کے ایک شاہین زادہ کو جس نے اجداد کی شاہیت حیدرآباد کے ہر باب پر ثبت ہے۔ جو حیدرآباد کی قسمت کو بدلنا چاہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تحریک صدارت کے لئے اس سے زیادہ کچھ کہنا ٹھیک نہیں کہ اقبال نوجوانوں کیلئے تڑپ کر مرا ہے اور آج ایک نوجوان اقبال کے جلسہ کی صدارت کر رہا ہے۔ اس طبقہ سے جس میں مایوس ہوا جا رہا ہوں۔ یہ امید کی ایک کرن سے کم نہیں۔''

(حوالہ: اقبال اور بزم اقبال حیدرآباد دکن ص ۹۳، ۱۹۴از عبدالروف عروج دارالادب پاکستان کراچی)

اقبال کے اس شاہین زادے نے ''اقبال کا شاہین زادہ'' کے زیر عنوان اقبال کے اس پیام حیات کی اقبال ہی کی زبان میں کس دلکش انداز میں تصویر کشی کی ہے۔

''میرے نالے فضائے حیدرآباد سے کچھ اس طرح نا آشنا ہو چکے تھے کہ مجھے یاد بھی نہ تھا کہ آج تقریر کرنی ہے۔ آج سے ڈیڑھ سال قبل علامہ اقبال کی زندگی میں اقبال کے تصور مومن کو پیش کر کے خود ان سے داد حاصل کی تھی اور آج ان کے انتقال کے بعد مختصراً اپنا تحفہ عقیدت ان کی سرمدی اور ابدی دعاؤں کی امید پر پیش کر رہا ہوں۔

اقبال کے پیام کا سب سے نمایاں حصہ مسلمان کی خودی کو بیدار کرنا ہے۔ اپنے پورے کلام میں انہوں نے اسی چیز کو باندازِ مختلف پیش کیا ہے اس کے لئے انہوں نے جو تشبیہیں اختیار کیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں شاہین اور شاہین زادہ کی تشبیہ ہے وہ جتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کرگس خاکی نہیں بلکہ شاہین بلند پرواز و فضا پیما ہے اقبال کے کلام کا رنگ شاہبازی سکھاتا

ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مسلمان کا مقام صحبت مرغ چمن نہیں بلکہ وسعت ارض و سما ہے۔

اس سلسلہ میں انہوں نے فطرت انسانی کے بہت سے پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان جب محنت و مشقت کے بغیر رزق حاصل کرنے لگتا ہے اور اس کا عادی بن جاتا ہے تو اس کی بہت سی ایسی صلاحیتیں اس سے چھن جاتی ہیں جن پر اس کی باعزت انفرادی و اجتماعی زندگی کا مدار ہے۔ ان انسانی صلاحیتوں میں سب سے ضروری اور اہم صلاحیت انسان کی شجاعت اور اس کا جذبہ عزت نفس ہے اور مفت خوری کا اثر سب سے زیادہ اسی صلاحیت پر پڑتا ہے اور شجاعت و بلند ہمتی جبن اور پستی خیال سے بدل جاتی ہے اسی کو اقبال نے اس شعر میں بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر شاہین بچوں کو بھی پابند قفس کر کے عطائے صیاد کا امیدوار بنا دو تو چند روز میں بٹیر کے پر کی پھڑ پھڑاہٹ سے بھی لرزہ براندام ہو جائیں گے۔

تنش از سایۂ بال تذروے لرزد می گیرد
چو شاہین زادہ اندر قفس با دانہ می سازد

تم غور کرو کہ کیا حیدر آباد کا مسلمان گذشتہ دو سو سال سے اندر قفس با دانہ ساختن کا عادی نہیں ہو گیا ہے اور کیا اسی کا نتیجہ آج شاہین زادوں کی سایۂ بال تذروے سے لرزہ براندام نہیں ہے۔

اقبال کے نزدیک آرام و راحت زاغ و زغن کا کام ہے اور قید و صید کی بندشیں قسمت شاہین کی سعادت اور جب تک کوئی ان مرحلوں سے نہیں گذرتا عزت و احترام کے مقام رفیع کو حاصل نہیں کر سکتا وہ کہتے ہیں۔

شد پے زاغ و زغن در بند و قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

انہوں نے مسلمانوں کو ترغیب دلائی کہ کرگس کی دوں ہمتی چھوڑیں اور شاہین کی پرواز اپنے بال و پر میں پیدا کریں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
شاہیں کا جہاں اور ہے، کرگس کا جہاں اور

اقبال کے نزدیک علم و فراست اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس وقت تک بے قیمت ہیں جب تک ان کا حامل تیغ و سپر سے بھی آراستہ نہ ہو ان کے نزدیک شاہین زادگی کی شرط اول مرد

غازی کی تیغ و سپر سے موانست ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔

من آں علم و فراست باپر کا ہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را"

(حوالہ: تقریر قائد ملت بعنوان اقبال کا شاہین زادہ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۹ء کے جشن یوم اقبال منعقدہ زمرد محل میں فرمائی۔ مشمولہ بہادر یار جنگ کی غیر سیاسی تقریریں ..... مرتبہ نذیر الدین احمد)

علامہ اقبال کے ایمان افروز انقلابی پیام سے قائد ملت اس درجہ متاثر تھے کہ ان کی کوئی تقریر یا تحریر ذکر و فکر اقبال سے خالی نہ ہوتی۔

(ماخوذ: از سوانح بہادر یار جنگ۔ جلد سوم مرتبہ نذیر الدین احمد۔ ناشر: بہادر یار جنگ اکیڈیمی حیدر آباد۔ جون ۱۹۹۰ء)

○○○○○

"درس اقبال کی ایک نشست میں غالبؔ کی مشہور غزل کا یہ شعر پڑھا گیا۔

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ خدا است
لیکن کشادِ آں زکمانِ محمدؐ است

تو ان کے سارے جسم پر رعشہ طاری ہوگیا اور روتے روتے حالت دگرگوں ہوگئی۔

(ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ بہ حوالہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں، ناشر بہادر یار جنگ اکادمی کراچی ۱۳۷، مطبوعہ جون ۱۹۷۶ء)

○

غلام محمد

تعلیمات اقبال سے لگاؤ

اقبال موجودہ صدی کے سب سے بڑے اسلامی مفکر، جن کی نظر مغرب کے جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری کو پہچاننے والی اور اسلام کے حقیقی نور سے آشنا جن کی فکر نے فلسفہ مغرب کے سارے سمندر کھنگال ڈالے لیکن کچھ نہ پایا اور جب اسلام کے بحر حقیقت میں غوطہ زنی کی تو جواہر سے اپنا دامن بھر لیا یہی متاع تھی جو وہ اپنے قافلہ میں لٹانا چاہتے تھے اور خوب لٹا گئے اسرار و رموز کے پڑھنے والوں سے ان کی وہ عاجزی نہیں کہ اے بار الٰہا! اگر میں نے کوئی بات قرآن سے ہٹ کر کہی تو مجھے قیامت کے روز حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاپوسی سے محروم رکھنا'' ۔۔۔ اسی طرح ''ضرب کلیم'' میں ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام جو نصیحت لکھی ہے اس میں اس کی کافی وضاحت ہے کہ اقبال فلسفہ کی وادیوں میں برسوں سرگرداں رہے لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا جو کچھ ملا وہ دین محمدی ہی میں ملا ۔۔۔ اس اعتبار سے اقبال کو ایک گونہ مناسبت مرشد رومی سے حاصل ہے ۔۔۔ مولانا روم بھی تو اپنے زمانے کے جلیل القدر فلسفی اور علوم عقلیہ کے ماہر تھے لیکن جب ان پر اسلام کے حقائق کھلے ہیں تو فلسفہ کی تار و پود انھوں نے بکھیر دی اور حرف حرف سے اسلامی تعلیمات کی عظمت کا اظہار فرمانے لگے اقبال مرحوم کو خود اپنے ہم رنگ رومی ہونے کا احساس تھا' چنانچہ فرماتے ہیں۔

''چو رومی در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرار جاں من
بہ دور فتنۂ عصر کہن او
بہ دور فتنۂ عصر رواں من

(ارمغان حجاز)

مرحوم محمد بہادر خاں ،اقبال کی اس جامعیت سے خوب آگاہ تھے ان کے کلام کا غائر مطالعہ فرمایا تھا قرآن وحدیث کی کسوٹی پر اسے پرکھ چکے تھے اور چونکہ اس میں مسلمانوں کے مرض کی تشخیص اور اس کے علاج کی اعلیٰ تجویز پاتے تھے اس لئے اسے انقلاب کا صحیح آلہ تصور فرماتے تھے۔

مرحوم فرماتے تھے کہ وہ مغرب زدہ اذہان جو اسلام کے راست مطالعہ سے گریز کرتے ہیں وہ اگر اس مغرب دیدہ اور اسلام فہمیدہ کے کلام کو پڑھ لیں۔ تو انہیں تعلیمات اسلامی کی عظمت کا اندازہ ہو جائے گا اور پھر خود اسلامی حقائق کو جاننے اور سمجھنے کی فکر کرنے لگ جائیں گے اسی نقطہ نظر سے مرحوم نے بیت الامت میں ہر ہفتہ درس اقبال کا سلسلہ جاری فرمادیا تھا جس میں پڑھے لکھے نوجوان شریک رہتے تھے ویسے شرکت کی عام اجازت تھی۔

درس اقبال:

مرحوم نے درس اقبال کے لئے بہترین اساتذہ کا انتخاب فرمایا تھا! ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ،ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور مولوی غلام دستگیر رشید اور خود مرحوم درس دیا کرتے تھے طرز یہ تھا کہ ہر ہفتہ جمع تو سب ہی ہوتے لیکن کوئی ایک پڑھتا جاتا اور اس کی تشریح کرتا تھا جہاں کوئی بات تشنہ رہ جاتی یا کسی کے ذہن میں کوئی اور مفہوم ہوتا تو اس کا اظہار کر دیا جاتا اور اس میں اساتذہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ سامعین بھی حصہ لے سکتے تھے ——— بالعموم یہ ہوتا کہ اور اساتذہ کلام کے فلسفیانہ پہلو پر روشنی ڈالتے اور مرحوم اس کی قرآنی توجیہہ فرماتے ——— اس درس کی حقیقت ڈاکٹر رضی الدین سے سنئے۔

> سچ پوچھئے تو جس درس میں وہ (قائد ملت) شرکت کرتے اس کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا تھا حاضرین ایک کیف وسرور سے سرشار ہو کر نکلتے تھے بقول ان کے جب وہ اقبال کے کسی شعر پر ''نمک مرچ'' لگانا شروع کرتے اور بات میں بات نکلتی جاتی تو دنیا بھر کے مختلف مسائل پیش نظر ہو جاتے ——— اقبال کے کلام کا ایسا مطالعہ شاید کیا یقیناً کہیں اور نہیں ہوا ہوگا مرحوم خود اقبال کی تعلیم اور ان کی تمناؤں کا مجسم نمونہ تھے۔ اور درس اقبال

کے وقت جب وہ نظروں کے سامنے ہوتے تو پھر اقبال کے بہت سے اشعار از خود واضح ہو جاتے تھے اور ان اشعار میں ایک نیا لطف محسوس ہونے لگتا تھا۔''

(تنظیم قائد ملت نمبر)

مرحوم کے عمیق مطالعہ قرآن و حدیث کا نتیجہ یہ تھا کہ باوجود تیاری کی فرصت نہ ملنے کے جب درس اقبال میں شریک رہتے تو اشعار کی تشریح میں بلا تکلف آیتیں اور حدیثیں پیش فرماتے چلے جاتے تھے۔ مرحوم کے انداز تفہیم کو سمجھنے کے لئے ایک مثال پیش ہے۔

اقبال کی مشہور مثنوی اسرار خودی پڑھی جا رہی تھی یہ شعر آیا۔

طبع مسلم از محبت قاہر است
مومن ار عاشق نہ باشد کافر است

ڈاکٹر رضی الدین فرمانے لگے۔ نواب صاحب یہاں تو اقبال نے شاعری کی ہے اتنا سخت فتوی میں نہیں سمجھتا کہ دیا جا سکتا تھا شاید اس کا کوئی ثبوت قرآن میں نہیں ملتا۔

نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ جی نہیں ڈاکٹر صاحب اقبال کوئی بات قرآن سے ہٹ کر نہیں کہتے دیکھئے آیت شریف ہے والذین آمنو اشد حبا للہ (جو مومن ہوتے ہیں ان کو اللہ تعالی سے اشد محبت ہوتی ہے) پھر اس کی تائید میں یہ حدیث شریف پیش کی۔''

''بخاری باب حب الرسول من الایمان، یعنی تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میری ذات (یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے نزدیک اس کے والدین اور اولاد اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جائے۔'' اب بتائیے کیا واقعی اقبال نے محض شاعری کی ہے یا اس میں حقیقت بھی ہے؟

مرحوم کی اقبال فہمی میں کیا کلام ہو سکتا ہے علامہ اقبال کی حیات میں اقبال کا تصور مومن پر تقریر کرتے ہوئے خود ان سے داد حاصل کی تھی پھر ان کے قوی حافظہ نے کلام اقبال کا کافی ذخیرہ محفوظ کر رکھا تھا جس سے دوران تقریر بہت فائدہ اٹھاتے تھے' اشعار اس موزونیت کے ساتھ لاتے کہ ان سے تقریر کا اثر بڑھ جاتا اور تقریر سے ان کی صحیح ترین توجیہہ ہو جاتی۔ اقبال کے بعض اشعار پر مرحوم نے مستقل تقریریں بھی کی ہیں مثلاً چند اشعار درج ذیل ہیں۔

یہ عقل جو مہ و پروین کا کھیلتی ہے شکار
شریک شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے

صفیں کج دل پریشان سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

ہر کہ عشق مصطفیٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست وغیرہ وغیرہ

اقبال کے کلام کی روانی، اس کے زور اور بے ساختگی کا کمال انہی مقامات پر ملتا ہے جہاں رسول کریم ﷺ کی منقبت ہوتی ہے۔ مرحوم بہادر یار جنگ جب ایسے اشعار پڑھتے ہوتے تو عجیب کیفیت طاری ہو جاتی خود بھی اثر میں ڈوب جاتے اور دوسروں کو بھی متاثر کر دیتے تھے۔

یہ چند اشعار تو مرحوم کے وردِ زبان ہو چکے تھے۔

در دلِ مومن مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است
آشکارا دیدنش اسرائے ما
در ضمیرش مسجدِ اقصائے ما
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

وہ خود متشکل فکر اقبال تھے

مرحوم کی زندگی "کلام اقبال" کی اثر انگیزی کا کیا پوچھنا ہے کہ درحقیقت ان کی ذات میں فکر اقبال خود متشکل ہو گئی تھی۔ اقبال کی اصل شاعری کا آغاز ۱۹۰۸ء کے بعد ہوا جب وہ دیار غرب کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے ہندوستان لوٹے تھے۔ البتہ مرتب صورت میں ان کی فکر پہلی مرتبہ "اسرار خودی" کے زیر عنوان منظر عام پر آئی مگر وہ تھی ایک فکری عملی تعین کی محتاج اور اثر آفرینی کے لئے کسی تشکل کی جویاں۔ قدرت کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ ۲۶ سال بہادر یار جنگ بلاد اسلامیہ کی سیاحت کر کے ۱۹۳۲ء میں جب ہندوستان لوٹے ہیں تو فکر اقبال ان کے سامنے اس طرح آئی گویا وہ تعین کی متلاشی تھی۔ بہادر یار جنگ نے اس فکر کو بالکل اپنا لیا اس کو ذہن و قلب میں بسا لیا اس طرح فکر اقبال کو ایک تشکل مل گیا جس کے بغیر وہ مسلم ہندوستان میں پوری طرح اثر انداز نہ ہو سکتی تھی۔ بہادر یار جنگ اقبال کا شاہین زادہ، اقبال کا مرد مومن اور اقبال کا قلندر بن کر ملت کے سامنے آ گئے اور ہندوستان کے طول و عرض میں اقبال کے نقیب بن کر قوم کو اقبالی فکر حیات بخش دی۔ آج وہی فکر اقبال ہے کہ اپنے تشکل سے محروم ہو کر نہ کوئی جاذبیت رکھتی ہے نہ ان کو متاثر کرتی ہے!

(ماخوذ از حیات بہادر یار جنگ مرتبہ غلام محمد ناشر بہادر یار جنگ اکاڈمی کراچی مطبوعہ جون ۱۹۷۳ء، ۲۲۳۔۲۲۸)

○○○○

نذیرالدین احمد

دَرسِ اقبالؔ

اقبالؔ کے کام، کلام اور مقام تک رسائی کے لئے ایک تڑپتے ہوئے قلب اور نظرِ کلیمی کی ضرورت ہے۔ اقبالؔ کے کلام و پیام سے جو والہانہ نسبت و تعلق نواب صاحب کو رہا۔ اس نسبت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یہ فیضِ خاص، فیضِ عام ہو جائے اسی احساس کے تحت درسِ اقبال کا آغاز ہوا۔ مولوی عبدالرحمٰن سعید (سعید صدیقی) کنوینر تھے۔ نواب صاحب کی دیوڑھی بیت الامت میں ہر جمعہ (عصر تا مغرب) درسِ اقبال کا اہتمام ہوتا تھا۔

ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر یوسف حسین خان اور پروفیسر غلام دستگیر رشید درس دیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ ان کی وفات کے دن تک جاری رہا۔

درسِ اقبالؔ کا مقصد یہ تھا کہ شرکا محفلِ درسِ اقبال ''گفتار کے اس غازی کے خواب کی تعبیر بنیں اور کردار کے غازی بن کر اس کی روح کو جنت الفردوس میں حقیقی سامان اطمینان مہیا کریں۔''

(حوالہ: خط نمبر ۳۹۶ ص ۴۱۰ قائد ملت۔ مکاتیب بہادر یار جنگ)

اس درسِ اقبال کی محفل کے تعلق سے اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''مبارک ہیں وہ لوگ جو اقبال کے کلام کو پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرے یہاں ہر ہفتے (جمعہ کو) بالالتزام ایک اجتماع ہوتا ہے اور اس میں اقبال کا کلام سمجھا سمجھا پڑھایا جاتا ہے اس میں ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر یوسف حسین جیسے علما، اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اقبال نے خود اپنے الفاظ میں مجازی لئے کو اپنے ہندی نغمہ میں ایسا دلکش بنایا کہ کتاب اللہ جس کو اسکے ماننے والوں نے پس پشت ڈال دیا تھا آج پھر آنکھوں کا نور بن رہی ہے۔'' حوالہ: خط نمبر ۳۹۶ ص ۴۱۰ مکاتیب بہادر یار جنگ)

اس حلقہ حکمت وادب کے بارے میں "بانگ اذان" کی صدائے حق نواز بھی سن لیجیے۔

حق مغفرت کرے بہادر خان مرحوم عجب قائدِ ملت عجب آزاد مرد تھے۔ بہادر خاں کا نصب العین اور مشن اسلاف اسلام اور دین کے زرین عہد کی دعوت الی اللہ کی آواز بازگشت تھی ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ہمارے دلوں میں اسلام کی عظمت وجلالت کا گم کردہ یقین تازہ کرتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا احسان یہی تھا کہ اسلامی افکار کی ایسی تبلیغ اور خطیبانہ تعبیر کرتے تھے جس سے ہم اسلام کو انسانی خدمت اور ارتقا کا ایک گراں قدر ذریعہ بناویں۔

اس لیے باقاعدہ ہفتہ وار مطالعہ و بحث و نظر کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس باب میں وہ حیدر آباد کا بہترین حلقہ حکمت وادب تھا۔ حقائق اقبال کے کئی مقامات کی عملی شرح دراصل خود ان کی اپنی مجاہدانہ زندگی تھی۔ کلام اقبال کی حقیقی بلندیاں ان کی زندگی کو قریب سے دیکھ کر سمجھ میں آجاتی تھیں۔ بقول اقبال وہ ایسے امیر تھے جن کی دلنوازی ان کی حکمت کا سرمایہ تھی اور جن کی نے نوازی ان کی اخلاقی طاقت تھی۔"

(حوالہ: بانگ اذان از پروفیسر غلام دستگیر رشید، بہادر یار جنگ مشاہیر دکن کی نظر میں مرتبہ نذیر الدین احمد، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی حیدر آباد)

اس درس میں اہل علم اور جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کے علاوہ عوام کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے اہل ذوق بڑے ذوق وشوق سے شرکت کرتے اقبال کا کلام سبقاً سبقاً پڑھایا جاتا، اور جب "نواب صاحب حیدر آباد میں ہوتے تو از خود درس میں شریک ہوتے ان کی موجودگی میں سب گونگے ہو جاتے اور ہر شعر کی تشریح آپ اپنے خاص انداز میں فرماتے۔"

(حوالہ: لسان الامت ص ۱۰، از مولوی عبد الرحمن سعید)

تفسیر اور حدیث میں ان کی معلومات جس پایہ کی تھیں، اس سے وہ لوگ بخوبی واقف ہیں جو درس اقبال میں شرکت کرتے تھے۔ سچ پوچھیے تو جس درس میں وہ شرکت کرتے تھے اس کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ حاضرین ایک کیف وسرور سے سرشار ہو کر نکلتے تھے۔ اقبال کا ایسا مطالعہ شاید ہی کسی اور نے کیا ہوگا ——— مرحوم خود اقبال کی تعلیم اور ان کی تمناؤں کا مجسم نمونہ تھے

اور درس اقبال کے وقت جب وہ نظروں کے سامنے ہوتے تو پھر اقبال کے بہت سے اشعار از خود واضح ہو جاتے تھے اور ان اشعار میں ایک نیا لطف محسوس ہونے لگتا۔''

(حوالہ: مولوی بہادر خاں مرحوم ایک عالم کی حیثیت سے، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں۔ مرتبہ نذیر الدین احمد۔ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی حیدر آباد)

(ماخوز از سوانح بہادر یار جنگ جلد دوم)

○○○○○

○

''بیسویں صدی کے ہر نوجوان کی طرح شاعری کا خبط شعور کی ابتدا کے ساتھ پیدا ہو چکا تھا۔ اور شوق شعر گوئی نے شعراء کے تذکروں اور دواوین کی طرف متوجہ کر دیا۔ آج اپنے کلام کا پورا نمونہ سامنے آجاتا ہے تو بے اختیار ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔ لیکن آج سے پچیس برس قبل ہم اپنے کو غالب اور ذوق سے کچھ زیادہ نہیں تو کم بھی نہ سمجھتے تھے۔ ہماری شعر گوئی اور مطالعۂ دواوین کا سب سے اچھا وقت صبح کے ابتدائی لمحات ہوا کرتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے ادب نے ایک معیاری کیفیت پیدا کی تو خود بخود یہ احساس ہونا لگا کہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں۔ اور ہماری میز سے ہٹ کر دواوین الماریوں کی زینت بنتے گئے اور ''بانگ درا'' کے سوا میز پر کچھ باقی نہ رہا۔ آخری دور میں اگر کسی کے کلام نے اقبال کے کلام کا ساتھ دیا تو وہ مولانائے روم کی مثنوی اور سعدی کی گلستان تھی۔''

(حوالہ: تقاریر و نگارشات بہادر یار جنگ۔ ناشر بہادر یار جنگ اکادمی کراچی۔ ۱۹۸۷ء)

سید حامد علی

نواب بہادر یار جنگ اور درسِ اقبال

(فاضل مضمون نگار بہادر یار جنگ کی محافل درس اقبال میں پابندی سے شریک ہوتے رہے۔ 1942ء میں جب درس اقبال کے سلسلہ کا آغاز ہوا اس وقت موصوف سٹی کالج میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے سٹی کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران 48-1947ء میں انجمن اتحاد طلبا عثمانیہ کے معتمد رہے، ان دنوں موصوف انوسٹمنٹ گائیڈنس بیورو کے صدر اور مدینۃ العلوم اکیڈیمی کے نائب صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔)

نواب بہادر یار جنگ مرحوم اکثر فرماتے تھے کہ ان کی تقاریر میں جو سحر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اقبال کے کلام کو پڑھا اور سمجھا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین جو ''الہلال'' میں شائع ہوئے ان کی دل کی گہرائیوں میں تازہ ہیں جس کو وہ اپنی تقاریر میں بروقت استعمال کرتے ہیں۔ نواب صاحب کی خواہش تھی کہ اقبال کے کلام کو تعلیم یافتہ طبقہ بشمول طلبا، پڑھیں اور سمجھیں اور اقبال کے پیام کو دوسروں تک پہونچائیں۔ کیوں کہ اقبال کا پیام انسانیت کیلئے ہے اور دین اسلام بھی انسانیت کے لئے ہے۔ جناب عبدالرحمٰن سعید جو نواب بہادر یار جنگ سے قریب تھے انہوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر آپ کی اجازت ہو تو درس اقبال آپ کی دیوڑھی بیت الامت میں شروع کیا جائے تاکہ شرکا، درس اقبال آپ سے بھی فکر اقبال کو سن سکیں نواب صاحب نے بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور اپنی شرکت کا وعدہ بھی فرمایا۔ جناب عبدالرحمٰن سعید نے مولوی غلام دستگیر رشید صاحب جو ان کے خاص دوست تھے اور نظام کالج میں فارسی کے لکچرر تھے ان سے خواہش کی کہ وہ درس اقبال کی ذمہ داری قبول فرمائیں کیونکہ اقبال کے کلام پر غور و فکر کرنے والی کوئی اور شخصیت نہیں ہے نواب صاحب بھی رشید صاحب سے متعارف تھے اور

ان کے جلسہ ہائے میلاد النبی میں تقاریر سن چکے تھے، درس اقبال 1942ء میں شروع ہوا اور نواب صاحب کے انتقال کے دن تک جاری رہا۔ نواب صاحب درس اقبال کے ختم ہونے کے بعد ہی جسٹس ہاشم علی صاحب کے مکان گئے اور وہاں انتقال فرما گئے درس اقبال نواب صاحب دیوڑھی بیت الامت واقع بیگم بازار میں ابتداء میں روز جمعہ پانچ بجے اور بعد میں روز اتوار اسی وقت میں ہونے لگا۔ موسم سرد اور بارش ہو تو نواب صاحب کی لائبریری ہال میں اور گرم ہو تو دیوڑھی کے سبزہ زار پر مغرب تک درس ہوتا۔ دوران درس چائے بڑے اہتمام سے پیش ہوتی۔ چائے کا وہ ذائقہ آج تک یاد ہے شرکا، درس بعد نماز مغرب واپس ہوتے۔ امامت نواب صاحب فرماتے اور غلام دستگیر رشید صاحب فرماتے۔ جو بزرگ و نوجوان (طلبا،) بہ پابندی شریک ہوتے ذیل میں ان کا مختصر تعارف پیش ہے۔

1۔ جناب عبدالرحمٰن سعید مرحوم:

جناب عبدالرحمٰن سعید نواب صاحب کے خاص دوست تھے وہ ملازم سرکار تھے اور محکمہ پولیس سے وابستہ تھے ادبی ذوق رکھتے تھے، اقبال کے کلام کو سننے کے اور سمجھنے کے لئے کوشاں رہتے تھے مزار قائد ملت واقع مشیر آباد پر جو کتبہ ہے اس پر نواب صاحب کی مختصر سوانح حیات ان ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ حیدر آباد سے شکاگو (امریکہ) منتقل ہو گئے وہاں پر بھی اقبال کے کلام کو عام کرنے اور اردو زبان کی ترقی و ترویج میں آخری دم تک کام کرتے رہے شکاگو میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

2۔ جناب غلام دستگیر رشید صاحب مرحوم:

جناب غلام دستگیر رشید صاحب زمانہ طالب علمی میں ذہین طالب علم شمار کئے جاتے تھے، انہوں نے فارسی و عربی میں اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور پیشہ درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ نظام کالج میں پروفیسر رہے کئی دینی و ادبی انجمنوں سے وابستہ رہے۔ رشید صاحب نہایت خلیق، منکسر المزاج اور اعلیٰ ذوق کے حامل تھے۔

3۔ جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی:

اعلیٰ پایہ کے ریاضی دان سمجھے جاتے تھے، ان کو عربی و فارسی پر بھی عبور تھا۔ نواب بہادر یار جنگ کے دوست تھے بوقت پولیس ایکشن یہ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر

تھے، اس وقت یہ چرچہ بھی رہا کہ ان کو نوبل پرائز کا اہل قرار دیا گیا ہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے وقت جسٹس ہاشم علی صاحب کے مکان واقع بخارہ بلڈر پر یہ صوفے پر نواب صاحب کے بازو ہی بیٹھے ہوئے تھے نواب صاحب حقہ کے دم کے بعد کچھ کہنا چاہتے مگر روح پرواز کر گئی۔ ڈاکٹر صاحب بعد میں پاکستان منتقل ہو گئے اور وہیں انتقال فرما گئے۔

4۔ مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی صاحب مرحوم:

مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی صاحب کا تعلق صوبہ بہار (ہندوستان) سے تھا انہوں نے فاضل کی ڈگری دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو سے حاصل کی تھی اور فاضل ادب فارسی جامعہ پنجاب سے۔ مگر انگریزی ادب سے واقف تھے مولانا شریک معتمد مجلس اتحاد المسلمین اور صدر پارلیمانی بورڈ بھی تھے انہوں نے اخبار روزنامہ اتحاد جو مجلس اتحاد المسلمین کا ترجمان تھا شائع کیا تھا اور اس کے ایڈیٹر بھی تھے۔ بعد میں یہ پاکستان منتقل ہو گئے اور وہیں انتقال فرما گئے۔ نوجوان طلباء میں حسب ذیل اصحاب اکثر شریک رہتے۔

1۔ سید یوسف حسینی صاحب:

جناب سید یوسف حسینی صاحب نظام کالج کے طالب علم تھے نواب صاحب سے عقیدت تھی درس اقبال میں شرکت کو لازم کر لیا تھا۔

2۔ جناب سید اسحاق حسینی مرحوم:

سید اسحاق مرحوم جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب مرحوم کے بڑے بھائی تھے اورسٹی کالج میں سائنس کے طالب علم تھے مگر ادب سے ذوق تھا۔ درس اقبال میں بہ پابندی شریک رہے۔

3۔ جناب منور علی خان صاحب لودھی مرحوم:

جناب منور علی خان صاحب لودھی معاشیات کے طالب علم تھے ان کو بھی اقبال کے کلام سے بڑا شغف تھا اور پابندی سے درس اقبال میں شریک رہتے۔

4۔ جناب سید خلیل اللہ حسینی مرحوم:

جناب سید خلیل اللہ حسینی مرحوم سٹی کالج میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے نواب صاحب کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے درس اقبال میں شریک ہوتے، اقبال کے اشعار کی تشریح وتصریح کو غور وخوص سے سنتے۔ جناب سید خلیل اللہ حسینی نے سقوط حیدرآباد کے بعد پیام اقبال کی اشاعت

کے کام کو نہ صرف جاری کھا بلکہ اقبال اکیڈیمی قائم کی، جس کی پر خلوص مساعی کا شہرہ نہ صرف حید رآباد بلکہ بیرون ممالک میں بھی پہنچ گیا ہے

6۔ سید حامد علی (مضمون نگار)

اس زمانہ میں سٹی کالج کا ادنیٰ طالب علم تھا، اقبال کے کلام سے غیر معمولی لگاؤ رہا غلام دستگیر رشید صاحب کی اقبال کے اشعار کی ہر پہلو سے تشریح سے بے حد متاثر، شاید ہی کوئی درس اقبال ناغہ ہوا ہو۔

7۔ جناب احمد علی صاحب

درس اقبال کی محفلوں میں پابندی سے شرکت کرنے والوں میں میرے دوست جناب احمد علی بھی شامل ہیں جو اس زمانہ میں نظام کالج میں طالب علم تھے اس کے علاوہ میرے خاص دوست جناب عبدالرزاق لاری بھی کبھی کبھار شریک ہوا کرتے جو ابراہیم جلیس کے قریبی ساتھی تھے اور اس زمانہ کے مقبول جریدہ (پرچم) میں ان کے مضامین شائع ہوا کرتے

جن بزرگوں اور دوستوں کا تعارف ہوا ہے اس کے علاوہ درس اقبال میں دیگر بزرگ و طلبا بھی کبھی کبھی شریک ہوتے ہمیشہ جملہ تعداد 15 اور 20 کے درمیان رہتی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب، کامریڈ مخدوم محی الدین مرحوم نے بھی درس اقبال میں شرکت کی ہے۔ ممکن ہے بعض شریک ہونے والے اصحاب کے نام میرے ذہن میں نہ رہے ہوں۔

درس اقبال کا انداز

پہلے سے ہی یہ طئے شدہ امر تھا کہ اقبال کا کلام جو کتابی شکل میں موجود ہے مثلاً بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم، پیام مشرق، پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق، مسافر۔ ایک ایک کتاب کے کلام کا درس شروع کیا جائے جب شرکاء درس اقبال بشمول نواب صاحب جمع ہو جاتے تو نواب صاحب رشد صاحب سے خواہش فرماتے کہ وہ درس کا آغاز فرمائیں۔ ایک نظم شروع کی جاتی اس کے اشعار پڑھے جاتے اس کی تشریح کی جاتی۔ ہر شعر کی رشید صاحب توضیح و تشریح اس طرح فرماتے کہ سب کو شعر کے معنی و مطلب سے آگاہی ہو جاتی۔ دوران درس شرکاء میں سے بھی اس شعر کی مزید تشریح و توضیح کو روا رکھا گیا تھا جو معلومات میں اضافہ کا باعث ہوتا تھا مولانا عبدالقدوس ہاشمی

انتقال کے دن یعنی 25۔ جون 1944ء کو درس اقبال میں شریک تھے شام ہو چکی تھی۔ سر مغرب جناب جسٹس ہاشم علی مرحوم کے مکان سے فون آیا جہاں پر نواب صاحب مدعو تھے کہ معلوم تھا کہ نواب صاحب کی یہ شام زندگی صبح دوام زندگی میں بدل جائے گی نواب صاحب کے مکان واقع بنجارہ ہلز پہونچے وہاں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور دیگر معززین شہر موجود تھے جس صوفے پر نواب صاحب تشریف فرما ہوئے اس کے بازو رضی الدین صدیقی صاحب تھے وہاں نواب صاحب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کو اقبال کا مصرعہ سنا رہے تھے "حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں" نواب صاحب کی خدمت میں حقہ پیش کیا گیا۔ حقہ کا کش لینا تھا کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ نہ نواب صاحب رہے نہ ریاست حیدرآباد، لیکن اور کارناموں کے علاوہ اقبال کے کلام کو قبول عام بنانے میں ان کے کارناموں کا فیض جاری ہے۔

(روزنامہ منصف حیدرآباد مورخہ 4 دسمبر 1999ء)

○○○○○

درس اقبال کے بارے میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے تاثرات:۔

"اقبال کے کلام کا ایسا مطالعہ شاید کیا، یقیناً کہیں اور نہ ہوا ہوگا۔ مرحوم خود اقبال کی تعلیم اور ان کی تمناؤں کا مجسم نمونہ تھے اور درس اقبال کے وقت جب وہ نظروں کے سامنے ہوتے تو پھر اقبال کے بہت سے اشعار خود واضح ہو جاتے اور ان اشعار میں ایک نیا لطف محسوس ہونے لگتا۔"

(حوالہ یادگار قائد۔ ناشر دارالتشہیر نظام شاہی روڈ۔ حیدرآباد دکن۔ سن اشاعت ۹ فروری ۱۳۵۴ف)

○

حسن یار جنگ
صدر بزم اقبال حیدرآباد دکن

قائد ملت اور بزمِ اقبال حیدرآباد دکن

۱۹۳۰ء میں میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلستان چلا گیا لیکن علامہ اقبال کے کلام کا مطالعہ وہاں بھی مجھ سے نہیں چھوٹا۔ ۱۹۳۹ء میں جب میں اپنی تعلیم مکمل کر کے حیدرآباد واپس پہنچا تو یہ وہ زمانہ تھا۔ جب میرے دوست اور ہم خیال رفیق نواب بہادر یار جنگ نے مجلس اتحاد المسلمین کے صدر کی حیثیت سے عوامی جلسے کرنے اور عوام میں مذہبی بیداری پیدا کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔

یہاں نواب بہادر یار جنگ سے میرے ذاتی تعلقات کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ مدرسہ عالیہ نظامیہ کالج میں ابتدائی تعلیم کے زمانہ ہی سے نواب بہادر یار جنگ سے میری ملاقات تھی۔ نواب صاحب مختصر عرصہ تک فرسٹ فارم میں میرے ہم جماعت بھی رہے تھے۔ ہم دونوں کے خیالات میں یکسانیت کے سبب ہماری ملاقات نے مخلصانہ دوستی کی صورت اختیار کر لی جو نواب صاحب کے انتقال تک نہ صرف جاری رہی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ میرے پاس مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایسے متعدد خطوط موجود ہیں جن سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

انگلستان سے واپسی کے بعد بھی نواب بہادر یار جنگ سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور اسلامی اور سیاسی مقاصد کے لئے مشوروں میں میں ان کا ساتھی رہا۔ ان کی اعلیٰ خطابت اور ذہانت کی وجہ سے عوام میں ان کی مقبولیت میں روز افزوں ترقی ہوتی رہی۔ علامہ اقبال کے کلام اور فلسفہ سے مجھے جو لگاؤ رہا تھا، نواب صاحب اس سے خوب واقف تھے۔ ہمارا مقصد حیات یہ تھا کہ مسلم عوام میں اسلامی جذبہ نہ صرف پیدا ہو بلکہ اس میں روز افزوں ترقی ہوتی رہے حتیٰ کہ مسلمان اپنے صحیح مقام سے واقف ہو جائیں اور اغیار نے ریاست پر جو مخالفانہ حملوں کا سلسلہ شروع کیا تھا اس کا صحیح طریقہ سے مقابلہ کر کے اس کا خاتمہ کیا جا سکے۔ نواب بہادر یار جنگ کی خواہش تھی کہ میں بھی ان کے ساتھ میدان عمل میں قدم رکھوں مگر بدقسمتی سے اعلیحضرت نظام دکن نے خانوادۂ شاہی سے تعلق رکھنے والے افراد کو سیاست میں حصہ لینے سے منع کر رکھا تھا لیکن علامہ اقبال کے کلام و پیام سے میرے لگاؤ نے میرے لئے ایک نئی راہ ہموار کر دی اور میں نے نواب بہادر یار جنگ کے مشورے سے بزم اقبال کے ادارہ میں عملی قدم جما دیا کیونکہ ہمارا جو مقصد حیات تھا وہ اس عملی ادارے کے ذریعے ہی پوری طرح تکمیل پا سکتا تھا۔

(اقبال اور بزم اقبال" حیدرآباد دکن۔ مرتبہ عبدالرؤف عروج" کے دیباچہ سے اقتباس)

عبدالوحید خاں

ادارۂ اقبال لکھنو میں بہادر یار جنگ کی افتتاحی تقریر

(مضمون نگار نے لکھنو میں ادارۂ اقبال قائم کیا تھا اور اس کے لئے موصوف نے بہادر یار جنگ کو افتتاح کی دعوت دی تھی۔ زیر نظر شذرہ اس افتتاحی تقریب کے بارے میں ہے۔)

الہ آباد سے آپ میری دعوت پر لکھنؤ تشریف لے گئے جہاں تین دن قیام فرمایا اس کی صورت یہ ہوئی کہ میں نے لکھنؤ میں ''ادارۂ اقبال'' قائم کیا تھا جس کا مقصد علامہ اقبالؒ کی تعلیمات کو مقبول بنانا اور ان کی شاعری کو عوام تک پہنچانا تھا جو ایک نئی اور غیر معمولی بات تھی۔ انیس اور دبیر کے شہر میں جس کا بہیشہ نعرہ ''انا والا غیری'' تھا اقبال کو بہ حیثیت شاعر کے تسلیم کرنا کفر سمجھا جاتا تھا۔ ''بال جبریل'' اور ''ضرب کلیم'' کی اشاعت کے بعد کچھ عرصہ تک اودھ پنچ میں کارٹونوں کے ساتھ اقبال کے خلاف مضامین نکلتے رہے۔ لکھنؤ کے ادیب شعرا، سوائے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے اقبال کو ایک مفکر اور بلند پایہ فلسفی تو مانتے تھے مگر زبان داں اور شاعری حیثیت سے ان کو کوئی درجہ نہیں دیتے تھے۔ میں نے ۱۹۴۱ء میں دہلی میں نواب صاحب سے ذکر کیا کہ آپ کو علامہ اقبال سے بے حد شغف ہے بلکہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کے خیالات کی روانی اقبال کی مرہون منت ہے۔ آپ میری مدد فرمائیں۔ لکھنو میں ''ادارہ اقبال'' کا افتتاح آپ خود کریں ورنہ اس کی کوئی آواز نہ ہوگی۔

آنجہانی سر تیج بہادر سپرو کا یہی مشورہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ آئندہ سال میں ضرور لکھنؤ آجاؤں گا، اور اس کام کو انجام دوں گا۔ اتفاق سے اس سال الہ آباد میں اجلاس ہوگیا۔ جہاں آپ تشریف لائے۔ حیدرآباد سے روانہ ہونے سے قبل ہی لکھنو کا پروگرام مجھ سے طے ہوگیا میں اسی سال اتفاق سے کچھ عرصہ کے لئے لکھنو کی شہری مسلم لیگ کا صدر بھی تھا اور میری خواہش تھی کہ مسلم لیگ کی طرف سے آپ کا استقبال ہو، اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کی طرف سے

ایڈریس پیش ہو۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ میں صرف ''ادارہ اقبال'' کی دعوت پر لکھنو جانا چاہتا ہوں اور اسی ایک ادارے کے پلیٹ فارم پر تقریر کروں گا۔ اسی لیے اور کسی قسم کا کوئی اہتمام نہیں ہونا چاہئے۔ آپ کی ادارہ اقبال کی تقریر کو نشر کرانے کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا تھا لیکن عین وقت پر اوپر سے ہدایت آگئی اور یہ اہتمام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ جنگ کی پابندیوں کی وجہ سے کھلے میدان میں جلسہ نہ ہوسکتا تھا۔ گنگا پرشاد میموریل ہال میں جلسہ ہوا۔ علامہ سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، مولانا حسرت موہانی اور ساغر نظامی کے علاوہ یو۔ پی کے تقریباً ہر جگہ کے ادیب اور علم دوست حضرات خاص طور سے شریک تھے۔ علامہ اقبال کی تعلیمات پر آپ نے ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی۔ میں نے علامہ سلیمان ندوی اور مولانا دریابادی صاحبان کو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد واہ واہ کہتے دیکھا۔ عام حاضرین کی عجیب کیفیت تھی مجھے یقین ہے کہ لکھنو میں نہ اس دن سے پیشتر کبھی ایسی تقریر ہوئی تھی اور نہ اس کے بعد کبھی ہوئی۔ کئی روز تک لکھنو میں آپ کے انداز تکلم اور طرز تقریر کا چرچا رہا۔

عبادت، سادگی اور بیباکی

اس شب سوا گیارہ بجے کے بعد کھانا کھایا گیا، کھانے کے بعد ایک بجے تک تمام مہمان آپ کی باتوں سے محظوظ اور علمی افکار سے مستفید ہوتے رہے۔ ایک بجے کے قریب آپ نے سونے کا ارادہ کیا چونکہ دیر زیادہ ہوچکی تھی۔ اس لیے آپ نے مجھ سے اپنی فرودگاہ (کوٹھی بیگم حبیب اللہ) پر اپنے کمرہ میں سونے کی فرمائش کی کیوں کہ صبح کی گاڑی سے آپ کو واپس جانا تھا۔ اس لیے میں اس رات وہیں سو گیا تقریباً چار بجے روشنی اور پیروں کی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی تو دیکھا کہ چارپائی کے پاس جانماز بچھی ہے اور نواب صاحب نماز تہجد میں مصروف ہیں نماز کے بعد دیر تک وظیفے میں مصروف رہے اور آخر میں دیر تک مسجود رہے اور گڑگڑا کر دعا مانگتے رہے۔

(مشمولہ بہادر یار جنگ ''اہل نظر کی نظر میں''، مرتبہ نذیر الدین احمد سن اشاعت مئی ۱۹۸۰ء)

بہ حوالہ اقبال اور بزم اقبال حیدرآباد دکن مرتبہ عبدالروف عروج۔ مطبوعہ دارالادب پاکستان ستمبر ۱۹۷۸ء۔

○○○○○

اقبال کا پیام آزادی

(یوم اقبال کے سلسلے میں ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو زمرد محل ناکیز میں جناب سید عبدالعزیز صدر المہام حکومت آصفیہ کی زیر صدارت ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا تھا اس جلسے میں حضرت قائد ملت نے ''اقبال کا پیام آزادی'' پر جو بصیرت افروز تقریر فرمائی وہ ہدیۂ ناظرین ہے۔)

حمد و نعت کے بعد فرمایا:

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

سچا شاعر وقت کے دربار کا نقیب ہوتا ہے اور وہی باتیں اس کی زبان سے شعر کا جامہ پہن کر نکلنے لگتی ہیں جو وقت کی ضرورت اور زمانہ کا تقاضہ ہوتی ہیں۔ اگر اقبال انیسویں صدی میں پیدا ہونے کے بجائے پندرہویں صدی یا سولہویں صدی میں پیدا ہوتے تو شاید ان کی شاعری میں ہم کچھ اور پاتے۔ ہماری خوش نصیبی ہے وہ اس زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں جب کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ سارا عالم اسلام نہ صرف عالم اسلام بلکہ سارا جہان مشرق معاشی، سیاسی اور ذہنی حیثیت سے مغرب کی غلامی کی لعنت میں گرفتار تھا۔ اقبال کا دل اور وہ حساس دل جس کو قدرت کا بہترین عطیہ کہنا چاہئے اپنے ماحول کی ان کیفیات سے تڑپ اٹھتا ہے اور وہ اپنی اس غلامی کا نوحہ پڑھنے لگتے ہیں کہتے ہیں۔

شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر — خشت ما سرمایۂ تعمیر غیر
زندگانی بر مراد دیگراں — جاوداں مرگ است نے خواب گراں

ترجمہ (مشرق اور مغرب آزاد ہیں اور ہم غیر کا شکار (غلام) ہیں اور ہماری اینٹ غیر کی تعمیر کا سرمایہ ہے (دوسروں کی مرضی کے مطابق) زندگی محض گہری نیند نہیں بلکہ مرگ جاودانی ہے۔)

جب وہ سیاسیات حاضرہ کی تماشہ گاہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو ہر طرف اصحاب تسلط واستبداد کی مکر سامانیوں اور فریب کاریوں سے سابقہ پڑتا ہے، ان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ غلاموں میں کس طرح نشہ غلامی کو تیز تر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور غلاموں کے قلب و دماغ کو کس طرح دیوار قفس میں آسودہ رہنے کی تعلیم دی جارہی ہے۔ وہ مرغ زیرک کی دانہ مستی پر تڑپ جاتے ہیں اور اس سیاسیات حاضرہ کو توڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس کی نسبت یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں۔

می کند بند غلاماں سخت تر — حریت می خواند او را بے بصر
در فضایش بال و پر نتواں کشود — با کلیدش ہیچ در نتواں کشود
گفت با مرغ قفس "اے درد مند — آشیاں در خانۂ صیاد بند
ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مرغ — او نبا شد ایمن از شاہین و چرغ"
از فسونش مرغ زیرک دانہ مست — نالہ ہا اندر گلوئے خود شکست
الحذر از گرمیِ گفتار او — الحذر از حرف پہلو دار او

ترجمہ:

- (دور حاضر کی سیاست) غلامی کے بند (قید) کو اور سخت کر دیتی ہے۔ حریت (آزادی) اسے بے بصر (اندھا) کہتی ہے۔
- (ملوکیت کی) اس فضاء میں پرواز ممکن نہیں۔ اس کی کنجی سے کوئی دروازہ نہیں کھل سکتا (یعنی کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا)
- (ملوکیت) قفس میں قید پرندے سے کہتی ہے کہ "(غلامی پر رضامند ہو کر) شکاری کے گھر میں اپنا آشیانہ بنا لے۔
- جو کوئی بیاباں اور باغ میں آشیانہ بناتا ہے وہ شاہین اور چرغ (یعنی شکار کرنے والے پرندوں سے) سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

● اس کے جادو کے اثر سے عقلمند پرندہ بھی دانہ مست بن جاتا ہے اور اس کا دانا اس کے گلے میں پھنس جاتا ہے۔

● اس کی گرمی گفتار اور پر فریب باتوں سے اللہ بچائے۔)

اقبال کو اقوام مستبد و غالب کی ان فسوں کاریوں سے زیادہ اقوام مغلوب ومحکوم کی کوتاہیوں پر غصہ آتا ہے وہ سمجھتے ہیں کو غالب اپنی حاکمیت میں اتنا قصوروار نہیں جتنا مغلوب اپنی محکومیت کے لیے ذمہ دار ہے کہتے ہیں۔

جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر!
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے، نہ مکیں ہے!
یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے!

انھوں نے بار بار اس بات کو ظاہر کیا کہ خواجگی کی مشکلوں کو آسان کرنے میں تمام تر مجرم غلام کی خوئے غلامی ہے۔

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم
اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور
سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام!
خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی
پختہ ہوجاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام!

انھوں نے ان صفات کو ایک ایک کر کے گنایا ہے جو قوموں میں گھن کی طرف لگتی ہیں۔ آگ کی طرح جڑ کو لگتی ہیں اور ان کو عضو معطل بنا دیتی ہیں۔ ان صفات کا ذکر جس درد بھرے انداز میں انھوں نے کیا ہے وہ ان کے قلب کی دردمندانہ کیفیات کا آئینہ دار ہے کہتے ہیں۔

وائے قومے کشتۂ تدبیرِ غیر — کارِ او تخریبِ خود تعمیرِ غیر
می شود در علم و فن صاحب نظر — از وجودِ خود نگردد باخبر!
نقشِ حق را از نگینِ خود سترد — در ضمیرش آرزوہا زاد و مرد
از حیا بیگانہ پیرانِ کہن — نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن

در دلِ شاں آرزوہا بے ثبات — مردہ زایند از بطونِ امہات

بر زماں اندر تلاشِ ساز و برگ — کارِ او فکرِ معاش و ترسِ مرگ

منعمان او بخیل و عیش دوست — غافل از مغز اند و اندر بندِ پوست

دینِ او عہدِ وفا بستن بغیر — یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ دیر

ترجمہ:

- اس قوم پر افسوس! جو غیر کی تدبیر (مکاری) کی شکار ہے۔ اُس کا کام اپنی تخریب اور غیر کی تعمیر ہے۔
- (ایسی قوم) علم و فن میں صاحب نظر تو ہو جاتی ہے لیکن خود اپنے وجود سے باخبر نہیں ہوتی۔
- (ایسی قوم نے) اپنے نگین سے حق کے نقش کو مٹا دیا۔ اس کے ضمیر میں پیدا ہونے والی آرزو فنا ہو گئی۔
- اس کے بوڑھے حیا سے بیگانہ اور اس کے نوجوان، عورتوں کی طرح اپنے بدن (کو آراستہ کرنے میں) مشغول رہتے ہیں۔
- ان کے دلوں میں آرزو باقی نہیں رہتی، گویا وہ اپنی ماؤں کے بطن سے مردہ پیدا ہوئے ہیں۔
- ان کا کام محض ساز و سامان کی تلاش، فکر معاش اور موت کا خوف ہے۔
- (ایسی قوم کے) دولت مند بخیل اور عیش پسند ہوتے ہیں۔ وہ مغز (روح) سے غافل اور پوست (جسم) کی قید میں رہتے ہیں۔
- ان کا دین غیروں سے عہد وفا باندھنا ہے یعنی وہ حرم کی اینٹ سے بتخانے کی تعمیر کرتے ہیں۔)

اقبال کو قوم سے زیادہ امیرانِ قوم پر غصہ ہے جو اس گلہ کے چرواہے ہیں اور اس قافلہ کے سالار اور جن کی تن پرستی اور جاہ مستی نے کم نگاہی اور کلیسا دوستی نے نورِ جان سے محرومی اور لا الہ سے بدنصیبی نے قوم کو غلامی کے بُرے دن دکھائے۔ ان کی نسبت کہتے ہیں۔

وا غم از رسوائی ایں کارواں — در امیرِ او ندیدم نورِ جاں

تن پرست و جاہ مست و کم نگہ — اندرونش بے نصیب از لا الہ

در حرم زاد و کلیسا را مرید! — پردۂ ناموسِ ما را بردرید

● میں اس کاروان (حرم) کی رسوائی سے غمگیں ہوں۔ اس کے قافلہ سالاروں (کے دلوں میں) نور جاں نظر نہیں آتا۔

● وہ وطن پرست، جاہ (ومنصب) میں مست اور کم نظر ہیں۔ ان کا اندرون الٰہ سے بے نصیب ہے۔

● وہ حرم میں پیدا تو ہوئے لیکن کلیسا کے مرید ہیں۔ انھوں نے ہماری ناموس کا پردہ چاک کر دیا ہے۔)

آپ کو جتنا غصہ امیروں پر ہے اتنا ہی قوم کے شعرا، حکما اور علما، پر جو ہمیشہ قوموں کی زندگی میں رہبر و رہنما رہے ہیں جن کی گرمی گفتار اور چستگی کردار سے قوم کے لیے نشان راہ پیدا ہوتے ہیں، جن کے فہم صحیح اور فکر مرتب نے مشکلات کے دشت و جبل کاٹ کر منزل کے قریب ترین راستے پیدا کیے۔ اقبال کو غم ہوتا ہے کہ غلام قوموں میں شعرا بھی پیدا ہوتے ہیں اور علما، حکما بھی لیکن ان کی فکر شیروں کو رم آہو سکھاتی ہے۔ قوموں کو غلامی پر رضامند کرتی ہے اور جب ان کا ضمیر انھیں ملامت کرتا ہے تو ان کا دماغ ان کو تاویل کا مسئلہ سکھا دیتا ہے۔

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی، حکما بھی،
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ!
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرح معانی میں یگانہ!
''بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رم آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ!''
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ!

''فلک زحل'' غدارانِ ملت

اقبال ان سب سے زیادہ ان غدارانِ ملت کی یاد سے آتش زیر پا ہو جاتے ہیں جنھوں نے حقیر و ناقابل لحاظ قیمت پر ملت کی آزادی فروخت کر دی۔ جن کی جاہ پرستی اور خطاب دوستی

نے قوموں کی زنجیر غلامی کی کڑیاں مضبوط کیں۔ سب سے زیادہ عجیب ''جاوید نامہ'' کا وہ مقام ہے جہاں اقبال پیر رومیؒ کی معیت میں ہفت افلاک کی سیر کرتے ہوئے ''فلک زحل'' پر پہنچتے ہیں اور اس دریائے خون کو دیکھتے ہیں جس کی موجیں طوفان خون اٹھا رہی ہیں جس کی فضاؤں میں طیور خوش الحان کی بجائے مار و کژدم اڑ رہے ہیں اور جن کے التہاب میں پارہ پارہ ہائے کوہ پگھل رہے ہیں۔ ان کو حیرت ہوتی ہے کہ اس طوفانی سمندر خونیں میں ایک چھوٹی سی کشتی پر دو بدنصیب تھپیڑے کھاتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اقبال ان کی مصیبت پر تڑپ اٹھتے ہیں اور پیر رومیؒ سے ان کا حال دریافت کرتے ہیں۔ پیر رومیؒ نے بتایا کہ وہ قوم فروش غدار ہیں۔ جنھوں نے ہندوستان کی آزادی اقوام مغرب کو بیچی اور بہت ارزاں بیچی۔ ان میں سے ایک ''بنگال'' کا میر جعفر اور دوسرا دکن کا ''میر صادق'' ہے اقبال کی آنکھوں سے حیرت و استعجاب کی کیفیت ابھی مٹی بھی نہیں کہ ابواب فلک وا ہوتے ہیں اور اقبال ایک حسینہ کو فضائے بسیط کی پنہائیوں سے اترتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس کا حسن عالم آشوب اقبال کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے لیکن اس کے پاؤں کی مضبوط اور وزنی زنجیریں چند بیائی ہوئی آنکھوں کو اشک آلود بنا دیتی ہیں اور اقبال کا دل تڑپ اٹھتا ہے جب وہ پیر رومیؒ سے سنتے ہیں کہ یہ حسینہ روح ہندوستان ہے جس کے پاؤں میں غلامی کی مضبوط زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ روح ہندوستان اپنے ایک فرزند سعید کو دیکھ کر بے اختیار وجد سرا ہوتی ہے اور اس کا نوحہ اقبال کے شاہکار ''جاوید نامہ'' کا شاہکار ہے۔ سنیے اور ان کانوں سے سنیے جن کانوں سے اقبال نے سنا تھا۔ تڑپ جائیے اور اس طرح تڑپیے جس طرح اقبالؒ تڑپا تھا اور کوشش کیجیے کہ سرزمین ہند پھر کسی جعفر و صادق کو نہ پیدا کر سکے اور اگر پیدا ہو تو آپ کے دست و بازو اس کو قوم فروشی کا موقع نہ دے سکیں۔

شمع جاں افسرد در فانوسِ ہند ــــ ہندیاں بیگانہ از ناموسِ ہند
مردکے نامحرم از اسرارِ خویش ــــ زخمۂ خود کم زند بر تارِ خویش!
بند ہا بردست و پائے من ازوست ــــ نالہ ہائے نارسائے من ازوست
خویشتن را از خودی پرداختہ ــــ از رسومِ کہنہ زنداں ساختہ
کے شبِ ہندوستاں آید بروز! ــــ مُرد جعفر زندہ روحِ اُو ہنوز!
تا ز قیدِ یک بدن وامی رہد ــــ آشیاں اندر تنِ دیگر نہد!

گاہ او را با کلیسا ساز باز — گاہ پیش دیریاں اندر نیاز
دین او آئین او سوداگری است — عنتری اندر لباس حیدری است
ظاہر او از غم دیں دردمند — باطنش چوں دیریاں زنار بند
جعفر اندر ہر بدن ملت کش است! — ایں مسلمانے کہن ملت کش است!
خند خندان است و باکس یار نیست — مار اگر خنداں شود جز مار نیست!
از نفاقش وحدت قوے دونیم — ملت او از وجود اولئیم!
ملتے راہبر کجا غارت گرے است — اصل او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روح جعفر الاماں
الاماں از جعفران ایں زماں!''

ترجمہ:

- ہندوستان کے فانوس کے اندر زندگی کی شمع بجھ گئی ہے اور ہندوستان والے ہندوستان کے ناموس سے بیگانہ ہیں۔
- وہ شخص جو اپنے اسرار سے ناواقف ہے اپنے ساز دل کے تاروں پر مضراب نہیں لگا سکتا۔
- اس کی وجہ سے ہمارے ہاتھ اور پاؤں میں (غلامی) کی زنجیریں ہیں اور ہمارے نالے نارسا ہیں۔
- ہندوستان کی رات دن میں کیسے بدل سکتی ہے؟ کیونکہ (غدار) میر جعفر تو مر گیا، لیکن اس کی روح ابھی زندہ ہے۔
- جب وہ ایک جسم کی قید سے رہا ہو جاتی ہے تو دوسرے جسم میں اپنا گھر بنا لیتی ہے۔
- کبھی وہ (ابلیس) کلیسا سے ساز باز کرتی ہے تو کبھی بتکدہ والوں سے نیازمندی کا اظہار کرتی ہے۔
- ان کا دین و آئین سوداگری ہے اور ان کا کام حیدری کے لباس میں عنتری ہے۔
- ایسے لوگ ظاہر میں دین کا غم تو ظاہر کرتے ہیں، لیکن باطن میں بت پرستوں کی طرح زنار پہنے ہوئے ہیں۔
- جعفر ہر بدن میں ملت کو مٹانے کے درپے رہتا ہے اور ایسے (بظاہر) مسلمان ملت کش ہیں۔

● ایسے لوگوں کی ہنسی (ایک دھوکہ ہے) وہ کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ اگر سانپ ہنسنے لگے تو وہ سانپ ہی رہتا ہے (یعنی بظاہر ملت کے ہمدرد لیکن ملت کے لئے زہرناک۔

● جہاں کہیں بھی کوئی ملت کا غارت گر ہے تو اس کی اصل صادق یا جعفر ہے (غداری کرنے والے)

● روح جعفر سے اللہ کی پناہ، اس زمانے کے جعفروں سے اللہ کی پناہ۔)

اس غلامی کے تصور سے اقبال پر ندامت و شرمندگی کی جو کیفیات طاری ہوتی ہیں وہی ان کے کلام کے اثر کی روح ہیں۔ غلامی میں ساری قوم مبتلا ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری قوم کی شرمندگی سمٹ کر قلب اقبال میں جمع ہوگئی ہے۔ وہ اس عالم غلامی میں اپنے ''قیام صلوۃ کو بے حضور'' اور اپنے سجدے کو بے سرور پاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ حق نے اپنے صدہا جلووں کو ان پر بے نقاب کر دیا۔

لیکن ان کی حق پرستی کا اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ وہ قلب غلام کو جلوۂ حق کے ایک نفس کا بھی مستحق نہیں پاتے ان کے نزدیک غلام، جلال خداوندی اور جمال لازوالی سے بے خبر ہے اور اس سے بڑھ کر وہ غلام میں کسی لذت ایمان کی تلاش کو بے سود سمجھتے ہیں چاہے وہ حافظ قرآن ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے نزدیک صرف عید آزاداں شکوہ ملک و دیں ہے اور غلاموں کی عید مومن کہلانے والوں کے ہجوم سے زیادہ کچھ نہیں۔

از قیامِ بے حضورِ من مپرس — از سجودِ بے سرورِ من مپرس
جلوۂ حق گرچہ باشد یک نفس — قسمتِ مردانِ آزاد است و بس
مردِ آزادے چو آید در سجود — در طوافش گرم رو چرخِ کبود
ما غلاماں از جلالش بے خبر — از جمالِ لازوالش بے خبر
از غلامے لذتِ ایماں مجو — گرچہ باشد حافظِ قرآن، مجو

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں!

ترجمہ:

● ہماری (نمازوں) کے بے حضور قیام اور ہمارے بے سرور سجدوں کا حال نہ پوچھ!

● حق کا جلوہ اگرچہ ایک دم (کچھ دیر) کے لئے کیوں نہ ہو، وہ صرف آزاد مردوں کی قسمت میں ہوتا ہے۔

● مردِ آزاد جب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے تو آسمان اس کے اطراف طواف کرتے ہیں۔

● اور ہم غلام (ایسے سجدہ) کے جلال اور جمال۔ از زوال سے بے خبر ہیں۔

● غلام (کے دل) میں ایمان کی لذت مت تلاش کر، چاہے وہ قرآن کا حافظ ہی کیوں نہ ہو۔

● آزادوں کی عید ملک و دین کا شکوہ (جلال و دبدبہ) ہے۔ محکوموں کی عید محض ایک ہجوم ہے۔

اس ندامت و شرمندگی کا انتہائی مقام وہ ہے جہاں اقبالؒ حالتِ غلامی میں اپنی زبان سے آقائے کائنات ﷺ کے حضور خجالت سے عرق عرق ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس بندۂ خدا مست و خود آگاہ کا اسم گرامی اتقدس و پاکی کا وہ نشان ہے جس کو کسی غلام کی زبان سے آلودۂ تکلم نہ ہونا چاہئے۔ جس کی صدائے قم نے غلاموں کی قبروں سے لاکھوں مردوں کو اٹھا کر آزادی کے تخت پر بٹھایا۔ اقبال اپنے آپ کو عالم غلامی میں اس کے نام نامی پر درود پڑھنے کے قابل بھی نہیں پاتا ہے

گرچہ دانا حالِ دل با کس نگفت   از تو دردِ خویش نتوانم نہفت
تا غلامم در غلامی زادہ ام   ز آستانِ کعبہ دور افتادہ ام
چوں بنامِ مصطفیٰؐ خوانم درود   از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ ''اے محکومِ غیر   سینۂ تو از بتاں مانندِ دیر
تا نداری از محمدؐ رنگ و بو
از درودِ خود میالا نامِ او''

ترجمہ:

● گرچہ دانا آدمی نے کبھی کسی سے اپنے دل کا حال بیان نہیں کیا، لیکن میں تجھ سے اپنا درد نہیں چھپا سکتا۔

- میں غلام ہوں اور غلامی (کے دور) میں پیدا ہوا ہوں، اس لئے میں کعبہ کے آستاں سے دور جا پڑا ہوں۔
- جب میں حضرت محمد ﷺ کے نام پر درود بھیجتا ہوں تو شرمندگی سے میرا وجود پانی پانی ہو جاتا ہے۔
- عشق کہتا ہے (طعنہ دیتا ہے) کہ "اے محکوم غیر! تیرا سینہ تو بتوں کی وجہ سے بتخانہ کے مانند ہے۔"
- جب تک تو حضرت محمد ﷺ کا رنگ و بو ہی نہیں رکھتا (تو) اپنے درود سے اس نام (مبارک) کو آلودہ نہ کر۔

"دل روشن اور نفس گرم"

اقبال نے ایک سے زیادہ مقامات پر آزاد و محکوم کا فرق واضح کیا ہے انھوں نے بتایا کہ آزاد و محکوم میں کوئی نسبت نہیں ہوتی آزاد کے رگ کی سختی، مظلوم کے رگ تاک کی طرح نرم رگ میں پیدا نہیں ہو سکتی، ایک کا دل زندہ، پُر سوز اور طربناک اور دوسرے کا دل مردہ، افسردہ اور نومید ہوتا ہے، ایک کی دولت دل روشن اور نفس گرم اور دوسرے کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک یہاں تک کہ ایک خواجۂ افلاک ہے اور دوسرا بندۂ افلاک۔ اقبالؒ اپنی ملت کو پہلی صف میں دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسری صف کو الگ کرنا چاہتے ہیں کتنے کان ہیں جوان کو صحیح سن رہے ہیں۔

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پُرسوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دلِ روشن، نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے، یہ خواجۂ افلاک

پیشۂ روباہی

اس فرق کو نمایاں کرنے کے بعد انھوں نے کبھی دنیا کی ہر مشہور و محکوم قوم کو اور کبھی ان میں سے ہر ایک کو جدا جدا مخاطب کیا ہے اور درس آزادی دیا ہے۔ وہ کبھی اقوام مغرب کی طرف پشت کر کہتے ہیں کہ جلوہ کے رنگ رنگ سے باہر نکلیں اور ترک فرنگ کے ذریعہ اپنی خودی کو پہچانیں اور حاصل کریں۔ ان کو سمجھاتے ہیں کہ ''مکر غربیان'' سے واقف ہو جانے کے بعد ''پیشہ روباہی'' سے کام نہیں چلتا اس میدان میں شیر ہی چل سکتے ہیں اور صرف شیر اور پھر شیر و روباہ کی تمیز یوں سمجھائی کہ ایک کی تلاش صرف عیش و عشرت ہے تو دوسرے کی صرف آزادی۔

گر ز مکر غربیاں باشی خبیر روبہی بگذار و شیری پیشہ گیر
چیست روباہی تلاش ساز و برگ شیر مولا جوید آزادی و مرگ

ترجمہ:

- اگر تو مغربیوں کے مکر (فریب) سے باخبر ہے تو روبہی (لومڑی کی چال) چھوڑ دے اور شیری کا پیشہ (طریقہ) اختیار کر لے۔
- روباہی کیا ہے؟ ساز و سامان کی تلاش اور شیر مولا آزادی اور (باعزت) موت چاہتا ہے۔)

خودی اور لذت نمود

وہ کبھی فلسطین کے عربوں کی طرف مڑتے ہیں اور ان کو سمجھاتے ہیں کہ تیرے وجود میں اب بھی وہ آگ چھپی ہوئی ہے جس کے سوز سے زمانہ فارغ نہیں ہوا، ان کی رہبری کرتے ہیں کہ تمہاری دوا جینوا یا لندن میں نہیں۔ کیوں کہ فرنگ کی جان تو یہود کے پنجہ میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے غلام قوموں کی نجات کا صرف ایک ہی نسخہ تلاش کیا وہ ان قوموں میں

خودی کی بیداری اور لذتِ نمود ہے۔ ان ہی کی زبان سے سنیئے۔

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے!
تری دوا نہ جینوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!
سنا ہے میں نے غلامی سے اُمتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے!

ان کو ہم کبھی حجازی عربوں سے مخاطب پاتے ہیں وہ انہیں روح پاک مصطفےٰ کا واسطہ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ تمھاری بداعمالیوں نے اس روح مقدس کو تڑپا رکھا ہے، ایک جگہ کہتے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!

کبھی کبھی زندگی کا گُر یوں سکھاتے ہیں۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

کبھی ان سے کہتے ہیں کہ جس نے اپنے آپ کو خودی کے بندھنوں سے چھڑایا اور بیگانوں کے ساتھ پیوست کیا وہ مرگیا اور اگر زندگی چاہتے، تو افسونِ فرنگی کو پہچانو اور اس کے افسوں کو آستینوں میں چھپا ہوا دیکھنے کی کوشش کرو۔ اس کا علاج ایک اور صرف ایک ہے کہ تمھارے جسم روحِ عمرؓ سے معمور ہو جائیں۔

ہر کہ از بندِ خودی وارست، مُرد
ہر کہ با بیگانگاں پیوست، مُرد
آنچہ تو با خویش کردی کس نکرد
روحِ پاک مصطفےٰ آمد بدرد!
اے ز افسونِ فرنگی بے خبر
فتنہ ہا در آستینِ اُو نگر
از فریبِ اُو اگر خواہی اماں
اشترانش را ز حوضِ خود براں
عصرِ خود را بنگر اے صاحب نظر
در بدن باز آفریں روحِ عمرؓ

ترجمہ:

- وہ مردہ ہے جس نے خودی کی پابندی کو ترک کر دیا اور جس نے غیروں سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔
- جو کچھ تو نے خود کے ساتھ (ناروا سلوک) کیا ہے کسی نہ کیا۔ (تمھارے کرتوتوں نے) روح پاک مصطفےٰ (ﷺ) کو دردمند کر دیا ہے۔
- اے کہ تو فرنگی کے جادو سے بے خبر ہے۔ اس کی آستین میں چھپے ہوئے فتنوں کو دیکھ!
- اگر تو اُس کے فریب سے امان چاہتا ہے تو اُس کے اونٹوں کو اپنے حوض سے ہانک دے (دور کر دے)
- اے صاحب نظر! اپنے زمانے کو دیکھ اور اپنے بدن میں روح عمرؓ کو پھر پیدا کر۔)

اقبال نے بعض مقامات پر اپنے آپ کو پوری طرح عیاں کر دیا ہے خصوصاً ان کا آخری چھوٹا سا رسالہ۔ ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' ان کے بے پردہ و بے پنہاں تعلیمات کا حامل ہے، اس میں انھوں نے آزادی حاصل کرنے کے جو گر سکھائے اور قوموں کو جس طرح پیغام آزادی دیا ہے اس کا نچوڑ شاید آپ کو ان چند شعروں میں ملے۔ میں ان کی تشریح نہ کروں گا۔ عرب کا مشہور مقولہ ہے! ''الکنایۃ ابلغ من الصراحۃ'' (اشارہ و کنایہ وضاحت سے زیادہ بلاغت رکھتا ہے) سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ جو نہیں سمجھتا وہ نہیں اٹھتا وہ نہیں چلتا اور جس کے پاؤں آشنائے راہ نہ ہوں وہ ہمیشہ بیگانۂ منزل رہتا ہے۔

اے اسیرِ رنگ، پاک از رنگ شو — مومنِ خود، کافرِ افرنگ شو
رشتۂ سود و زیاں در دستِ تست — آبروئے خاوراں در دستِ تست
ایں کہن اقوام را شیرازہ بند — رایتِ صدق و صفا را کن بلند
اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں — آں یدِ بیضا برآر از آستیں
خیز و از کارِ اُمم بکشا گرہ — نشۂ افرنگ را از سر بنہ
دانی از فرنگ و از کارِ فرنگ — تا کجا در قیدِ زنارِ فرنگ
زخم ازو نشتر ازو سوزن ازو — ماہ جوئے خون و امید رفو
اہل حق را زندگی از قوت است — قوتِ ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوت بے رائے جہل است وجنوں

ترجمہ:

● تو رنگ کا اسیر ہے (یعنی رنگ، نسل وغیرہ) کے امتیازات میں گرفتار ہے۔ اس رنگ سے پاک ہو جا۔ اپنا مومن اور افرنگ کا کافر بن۔

● تیرے نفع ونقصان کا رشتہ خود تیرے ہاتھ میں ہے۔ مشرق والوں کی آبرو تیرے ہاتھ میں ہے۔ ● (ان پرانی (بکھری ہوئی) قوموں کی شیرازہ بندی کر، صدق وصفا کے جھنڈے کو بلند کر۔

● اے تہذیب ودین کی دولت کے امین، ید بیضا کو اپنی آستین سے باہر نکال۔

● اٹھ! اور قوموں کے کاموں میں پڑی ہوئی گرہ کو کھول دے۔ اپنے سر سے افرنگ کا نشہ نکال دے۔

● زخم بھی اُسی کی نشتر سے (لگائے ہوئے ہیں) اور سینے والی سوئی بھی اُسی کی ہے۔ ہم ہیں اور خون کی ندی ہے اور (اسی) سے امید رفو (رکھتے ہیں) (یعنی فرنگ زخم لگانے والا ہے اور اس زخم کو سینے کی کوشش کرتا ہے تاکہ ہم اسے ہمدرد سمجھیں، یہ کیسے ممکن ہے؟)

● اہل حق کی زندگی قوت سے (قائم) ہے اور ہر ملت کی قوت (کا انحصار) جمعیت (اتحاد سے) ہے۔

● دانائی بغیر قوت کے محض مکر وفسوں (بے حقیقت ہے) اور دانائی بغیر قوت کے جہل اور جنوں ہے۔)

آزادیٔ انسانیت

اقبال نے جو درس خودی دنیا کو دیا اور جو اس کے پیام کی اصل اور اس کی شاعرانہ اور حکیمانہ زندگی کی روح تصور کی جاتی ہے۔ اقبال فہم مجھے معاف کریں اگر میں کہوں کہ وہ اصل نہیں ذریعہ ہے۔ اقبال کا پیام ہو کہ مرکزیت یا اقبال کی تعلیم وتمدن ہو کہ حاکمیت ان سب کی روح

انسانیت کی آزادی کا ذریعہ ہے اور آزادیٔ انسانیت کو اقبال کا اصلی پیام سمجھتا ہوں۔ اگر آپ اقبال سے خود پوچھیں کہ خودی کی بیداری کا فائدہ؟ مرکزیت کا نتیجہ؟ وحدت قوم و ملت کا مآل؟ (تو جواب یہی ہے)

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

ترجمہ

(حضرت مصطفیٰ (ﷺ) تک اپنے آپ کو پہنچا کہ دین کا تمام تر وجود ان کی ہی بدولت ہے۔ اگر (اُن کے آستانہ تک) رسائی نہیں ہے تو (ہر کام) بولہبی ہے۔)

اقبالؒ کہتے اور آج بھی سننے والوں کو روح اقبالؒ جواب دے رہی ہے کہ یہ سب اس لئے کہ انسان اپنا اصلی مقام پہچانے اور غیر اللہ کے تسلط و استبداد سے نکل کر حریت کاملہ کا تاج پہنے اور آزادی کے تخت پر جلوہ فرما ہو جائے۔

[ماخوذ از (۱) ''سیاسی تقاریر'' لسان الامت بہادر یار جنگ'' ناشر دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد دکن مطبوعہ نومبر ۱۹۴۱، مرتبہ سید علی شبیر حاتمی و محمد اقبال سلیم گاہندری۔
(۲) ''فکر اقبال'' مرتبہ غلام دستگیر رشید، ناشر نفیس اکیڈیمی حیدرآباد۔ مطبوعہ اکتوبر ۱۹۴۱ء]

○○○○○

اقبال کا شاہین زادہ

(قائد ملت کی تقریر جو انہوں نے اپنی زبان بندی کے ایک سال بعد ۲۱، اپریل ۱۹۳۹ء کو یوم اقبال کے موقع پر کی۔)

میرے نالے فضائے حیدرآباد سے کچھ اس طرح نا آشنا ہو چکے تھے کہ مجھے یاد بھی نہ تھا کہ آج تقریر کرنی ہے۔ آج سے ڈیڑھ سال قبل علامہ اقبال کی زندگی میں اقبال کے تصور مومن کو پیش کر کے خود ان سے داد حاصل کی تھی اور آج ان کے انتقال کے بعد مختصراً اپنا تحفۂ عقیدت ان کی سرمدی اور ابدی دعاؤں کی امید پر پیش کر رہا ہوں۔

اقبال کے پیام کا سب سے نمایاں حصہ مسلمان کی خودی کو بیدار کرنا ہے۔ اپنے پورے کلام میں انہوں نے اسی چیز کو بہ انداز مختلف پیش کیا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے جو تشبیہیں اختیار کیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں شاہین اور شاہین زادہ کی تشبیہ ہے، وہ جتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کرگس خاکی نہیں بلکہ شاہین بلند پرواز و فضا پیما ہے۔ اقبال کے کلام کا رنگ شاہبازی سکھاتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مسلمان کا مقام صحبت مرغ چمن نہیں بلکہ وسعت ارض و سما ہے۔

اس سلسلہ میں انہوں نے فطرت انسانی کے بہت سے پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان جب محنت و مشقت کے بغیر رزق حاصل کرنے لگتا ہے اور اس کا عادی بن جاتا ہے تو اس کی بہت سی ایسی صلاحتیں اس سے چھن جاتی ہیں جن پر اس کی باعزت انفرادی و اجتماعی زندگی کا مدار ہے ان انسانی صلاحیتوں میں سب سے ضروری اور اہم صلاحیت انسان کی شجاعت اور اس کا جذبۂ عزت نفس ہے اور مفت خوری کا اثر سب سے زیادہ اسی صلاحیت پر پڑتا ہے اور شجاعت و بلند ہمتی جبن اور پستی خیال سے بدل جاتی ہے اسی کو اقبال نے اس شعر میں بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر شاہین بچوں کو بھی پابند قفس کر کے عطائے صیاد کا امیدوار بنا دو تو چند روز میں وہ بٹیر کے پر کی پھڑپھڑاہٹ سے بھی لرزہ براندام ہو جائیں گے۔

تنش از سایۂ بال تدروے لرزہ می گیرد
چوشاہین زادۂ اندرقفس باوانہ می سازد

تم غور کرو کہ کیا حیدرآباد کا مسلمان گذشتہ دوسو سال سے ''اندرقفس باوانہ ساختن'' کا عادی نہیں ہوگیا ہے اور کیا آج یہ شاہین زادہ سایۂ بال تدرو سے لرزہ براندام نہیں ہے۔

اقبال کے نزدیک آرام و راحت زاغ وزغن کا کام ہے اور قید وصید کی بندشیں قسمت شاہین کی سعادت اور جب تک کوئی ان مرحلوں سے نہیں گزرتا عزت واحترام کے مقام رفیع کو حاصل نہیں کرسکتا وہ کہتے ہیں۔

شہ پر زاغ وزغن دربندوقید وصید نیست
کیں سعادت قسمت شہ بازو شاہین کردہ اند

انہوں نے مسلمانوں کو ترغیب دلائی کہ کرگس کی دوں ہمتی چھوڑیں اور شاہیں کی پرواز اپنے بال وپر میں پیدا کریں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضامیں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اقبال کے نزدیک علم وفراست اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس وقت تک بے قیمت ہیں جب تک ان کا حامل تیغ وسپر سے بھی آراستہ نہ ہو ان کے نزدیک شاہین زادگی کی شرط اول مرد غازی کی تیغ وسپر سے موانست ہے۔ فرماتے ہیں کہ

من آن علم وفراست باپرکاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

○○○○○

(ماخوذ از ''سیاسی تقاریر'' لسان الامت بہادر یار جنگ ۔ ناشر دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد ۱۹۴۱ء، ص ۱۵ تا ۱۸)

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے

(بہادر یار جنگ کے خطباتِ صدارت سے چند اقتباسات)

O

''ہماری ان تمام کوششوں کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک نہایت مخلص، صداقت شعار بے لوث کارکن، دوسرا سرمایہ۔ گذشتہ پندرہ سالہ قومی جدوجہد میں، میں نے یہ تجزیہ کیا کہ کسی وقتی ضرورت کی تکمیل کے لئے جس میں جذبات کی برانگیختگی کا بھی کچھ نہ کچھ سامان ہو بڑی آسانی سے کارکن مہیا ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ آمادگی آنی اور اسی لئے فانی ہوتی ہے۔ اگر کوئی مستقل کام ان کے سپرد کیا جائے جو دل سے دماغ سے تعلق رکھتا ہو، جس کے نتائج فوری نہیں بلکہ دیر رس ہوں اور جس میں ابتداً نہایت تحمل اور برداشت کے ساتھ مسلسل کام کرنا پڑے تو یہ اندازہ کیا گیا کہ بڑے جوش سے آمادہ ہونے والے آہستہ آہستہ میدانِ عمل سے ہٹ گئے اور کام چھوڑ دیا۔ میں سب سے زیادہ جس چیز کی طرف اپنے بھائیوں کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ استقامت اور عمل پیہم کی منزل ہے۔''

(خطبۂ صدارت، ۹ر جنوری ۱۹۴۰ء)

O

''یاد رکھو (قوموں کی زندگی میں) بارہا ایسے ادوار بھی آتے ہیں جب کہ اُن کا سب سے بڑا کمال لڑنا اور مر جانا نہیں، بلکہ باقی رہنا اور آگے بڑھنا ہوتا ہے۔''

(خطبۂ صدارت، ۹ر جون ۱۹۴۰ء)

O

''یاد رکھو! برق و باراں سے زیادہ سخت خدا کا وہ عذاب ہوتا ہے، جو قوموں پر محرومیٔ تفکر صحیح کی صورت میں نازل ہوتا ہے، خدا ہم کو اس عذاب سے محفوظ رکھے۔''

(خطبۂ صدارت ۹ر جون ۱۹۴۰ء)

O

O

''میں اپنے ساتھیوں کا ممنون نہیں ہوں کہ انھوں نے اب کی مرتبہ پھر مجھے اپنا صدر منتخب کیا۔ نہ میں ذمہ داریوں سے گھبراتا ہوں، نہ مجھ پر نفس کی وہ ابتدائی کیفیات طاری ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے عزت صدارت پر اتراؤں۔ میں نہایت دیانت اور ایمانداری سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ مجھے کم از کم ایک سال کے لئے صدارتی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر کے پوری فرصت کے ساتھ موقع دیا جاتا کہ میں چند مخلص نوجوانوں کو ساتھ لے کر شہر کی ہماہمی سے دور کسی گمنام گوشہ میں بیٹھ جاتا اور آپ کے لئے ایسے معمار فراہم کرنے کی کوشش کرتا، جن کے سپرد اپنا مستقبل کر کے آپ مطمئن ہو سکتے ہیں۔''

(خطبۂ صدارت، ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۲ء)

O

''آج ہم کو اُن کی ضرورت نہیں ہے جو شجرِ ملت پر پھول بن کر مہکنا چاہتے ہوں اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہوں۔ ہمیں اُن کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہوتے ہیں اور جڑوں کو مضبوط کرتے ہیں، جو مٹی اور پانی میں مل کر رنگین پھول پیدا کرتے ہیں۔ ہم کو ان کی ضرورت نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نگاہ نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہتے ہوں۔ ہم ان بنیاد کے پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دب کر استحکام عمارت کی ضمانت دے سکتے ہوں۔''

(تقریر۔ ۲۶ر دسمبر ۱۹۴۳ء)

O

''قائد اور صدر کا سب سے بڑا ہتھیار سخن دلنواز ہے۔ اس کی زبان کو تیر و نشتر نہیں بلکہ کمند محبت ہونا چاہئے اور اس کے نخچیر اپنے لوگ ہی نہیں بلکہ سب سے زیادہ ان کو ہونا چاہئے جو اپنے اندر کوئی نقص رکھتے ہیں اور یہ دونوں صفات اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتیں جب تک جان پر سوز نہ ہو۔''

(تقریر جلسۂ سالانہ الاتور، حیدرآباد دکن)

O

''ملت اسلامیہ میں مذہبی حیثیت سے مختلف مکاتیب خیال کو وجود میں آکر صدیاں گذر گئیں۔ ہر نئے مکتب خیال نے جس کو آج عرف عام میں فرقہ کہا جاتا ہے، دنیا میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے لئے اور ہر پرانے مکتب خیال نے ان نئے مکاتیب خیال کو اُبھرنے سے روکنے کے لئے اپنی جدوجہد و کوشش کا کوئی مقام اٹھا نہیں رکھا۔ آج ہمارا فن مناظرہ کا لٹریچر انہی اختلافی مباحث کی گتھیوں سے اُبھا پڑا ہے۔ عقیدۂ قدیم اور فکر جدید نے ابتدا سنجیدہ بحث ونظر کی صورت اختیار کی لیکن رفتہ رفتہ تفوق و برتری کے جذبات نے خلیجوں کو وسیع تر کیا اور تردید و اختلاف نے ترک و تکفیر تک نوبت پہنچا دی۔ نتیجۃً آج ہم خدائے واحد کے پرستاروں اور ایک نبیؐ کے ماننے والوں اور ایک کتاب سے اکتساب ہدایت کرنے والوں کو ایک دوسرے کے اسلام و ایمان کا منکر پا رہے ہیں اور جب ایک دوسرے کے نقطۂ خیال سے دنیا میں ملت اسلامیہ کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں کافروں کے سوا کہیں مسلم کا پتہ نہیں ملتا! کیا عالم اسباب کا کوئی واقعہ اس سے زیادہ قابل ماتم ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے میرے یہ خیالات آپ کے بعض بنیادی اصول سے ٹکرائیں لیکن میں ان سارے اندیشوں سے بے نیاز ہو کر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اب اختلافی مسائل پر ایک دوسرے سے الجھنا چھوڑ دیجئے۔ ''الٰہیات کے ان لات ومنات'' نے ہمارے لمحات حیات سے خدا پرستی کی فرصت کو چھین لیا ہے۔ اختلافی مسائل پر جو کچھ کہا گیا اور جتنا کچھ لکھا گیا وہ کافی سے بہت زیادہ تھا، اور اگر اس نے سب مسلمانوں کو ہم خیال نہ کیا تو کیا آج توقع رکھتے ہیں کہ آپ کوئی بہتر نتیجہ پیدا کر سکیں گے؟

O

O

ایک صاحب سجادہ دوست کے نام

(''مجھ رند بادہ خوار سے پوچھو، یہ مشیخت تو کچھ تم کو بھاتی نہیں، دنیا کارگہ عمل ہے، اس کو بھی تم نے عزلت گزینی ہی میں گزار دیا تو اللہ میاں کے سوال کا کیا جواب کہ زندگی میں کیا کرتے۔ اللہ حجروں کی چار دیواری کے اندر نہیں، آفاق کے ذرہ ذرہ میں، بیکسوں کی آہ و بکا میں، بے وسیلوں کے نالہ و شیون میں، مظلوموں کی کراہ میں، داد خواہوں کی تڑپ میں، اس کے راستہ میں رسوائیوں اور ذلت میں ملے گا، باہر نکلو اور دیکھو، اشرف المخلوقات انسان، حامل بار امانت انسان، خلیفۃ اللہ انسان، کس طرح ذلیل و خوار ہو رہا ہے، اسکی سربلندیوں کا سامان کرو، یہی اصل عبادت، یہی اصل دین ہے —— میری نہیں سنتے تو سعدی کی سنو:

طریقت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

خدا تم کو اچھا رکھے، اپنی محبت میں ایسا سرشار کرے کہ اس کی کائنات کے چھوٹے سے چھوٹے ذریعہ کی بے قراری تم کو تڑپا دے اور گوشۂ عزلت سے باہر کھینچ نکالے، والسلام''۔)

مکتوب ۴۴۵

۲۲ مئی ۱۹۳۸ء

OOOOO

حیاتِ بہادر یار جنگؒ بہ یک نظر

☆ تاریخ ولادت	۵/مارچ ۱۹۰۵ء
☆ تاریخ وفات والدہ صاحبہ	۱۳/مارچ ۱۹۰۵ء
☆ تاریخ وفات والد صاحب	۱۹۲۳ء
☆ تاریخ شادی خانہ آبادی	۳۰/مئی ۱۹۱۹ء
☆ تاریخ ولادت دختر نیک اختر	۸/مارچ ۱۹۳۷ء
☆ تاریخ وفات دختر نیک اختر	۲۴/اکتوبر ۱۹۳۷ء
☆ مجلس تبلیغ اسلام کا قیام	۱۹۲۷ء
☆ مجلس وضع قوانین کی صدارت	۳۱/ڈسمبر ۱۹۲۹ء
☆ مجلس جاگیرداران کی صدارت	۲۲/ستمبر ۱۹۳۰ء
☆ تاریخ سرفرازی خطاب	۲۵/نومبر ۱۹۳۰ء
☆ روانگی بعزم حج	۱۲/اپریل ۱۹۳۱ء
☆ جدہ میں آمد	۲۲/اپریل ۱۹۳۱ء
☆ روانگی یمنی	۲۶/اپریل ۱۹۳۱ء
☆ وقوف عرفات	۲۷/اپریل ۱۹۳۱ء
☆ ملاقات شاہ ابن سعود اور امیر فیصل مرحوم	۴/مئی ۱۹۳۱ء
☆ مدینہ منورہ میں آمد	۸/مئی ۱۹۳۱ء

☆ روانگی بیروت	۲۲ رمئی ۱۹۳۱ء
☆ قاہرہ میں آمد	۱۶ رجون ۱۹۳۱ء
☆ دمشق میں آمد	۱۹ رجولائی ۱۹۳۱ء
☆ استنبول میں آمد	۱۷ رجولائی ۱۹۳۱ء
☆ بغداد میں آمد	۷ راگست ۱۹۳۱ء
☆ طہران میں آمد	۲۱ راگست ۱۹۳۱ء
☆ کابل میں آمد	۲۸ رستمبر ۱۹۳۱ء
☆ بلاد اسلامیہ کے سفر سے واپسی	۳۰ راکتوبر ۱۹۳۱ء
☆ علامہ اقبال سے پہلی ملاقات (مولانا خواجہ حسن نظامی مرحوم کے ہمراہ ڈاکٹر انصاری کے مکان پر دہلی میں)	۱۳ رمارچ ۱۹۳۲ء
☆ دہلی میں خطاب بعنوان ''ایشیا کدھر سفر کر رہا ہے'' (مولانا خواجہ حسن نظامی کی دعوت پر)	۲۴ رمارچ ۱۹۳۲ء
☆ یوم اقبال منعقدہ حیدر آباد دکن سے خطاب	۱۵ رڈسمبر ۱۹۴۰ء
☆ لاہور میں مسلم لیگ کے جلسے سے خطاب	۲۴ رمارچ ۱۹۴۱ء
☆ جاگیر و خطاب سے دستبرداری	۳ راکتوبر ۱۹۴۱ء
☆ مسلم لیگ کراچی کی تاریخی تقریر	۲۴ رڈسمبر ۱۹۴۳ء
☆ تاریخ وفات	۲۵ رجون ۱۹۴۴ء

○○○○○

فکرِ اقبال کا مثالی پیکر

''اقبالیات سے قایدِ ملت کا تعلق محض قال کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ اس نے حال کی صورت اختیار کر لی تھی۔ علامہ اقبال کی تخلیقات کو انھوں نے اپنے نصب العین سے ہم آہنگ پایا۔ کیونکہ ان کے کلام میں قرآن کی ترجمانی، عشقِ رسول کا والہانہ اظہار، اسلامی تصورات کی عکاسی، مسلمانوں کے لئے بیداری کا پیام اور ملت اسلامیہ کے عروج و زوال کا واضح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اقبال کی یہ فکر نواب بہادر یار جنگ کے قلب اور قالب میں متشکل ہوگئی۔ جب انھوں نے حیدرآباد میں بیداری کا نعرہ لگایا تو وہ ملت جو خوابِ غفلت میں مدہوش تھی بیدار ہوگئی۔ قائدِ ملت اقبال کے اس شعر کا مصداق بن گئے ؎

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی''

(سوانح بہادر جنگ، مرتبہ نذیر الدین احمد)

○○○○○

Vol': 14 Issue : 1
April 2005

ISBN: 81-86370-27-7
Phone : 55663950

"IQBAL REVIEW"

(JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY HYDERABAD)

SPECIAL ISSUE

IQBAL
AUR
BAHADUR YAAR JUNG

IQBAL ACADEMY

Gulshan-e-Khaleel, 10-5-7/1, Masab Tank, Hyderabad - 500 028, A.P. INDIA